قرۃ العین حیدر

روس اور کشمیر

پر

رپورتاژ

قرۃ العین حیدر

مکتبہ اُردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر .... سرفراز احمد

مطبع .... ندیم یونس پرنٹرز لاہور

قیمت .... بارہ روپے

ترتیب

روس

کشمیر

جب برف پگھلی

جون ۱۹۷۲ء۔ دریچے کے باہر ماسکو یونیورسٹی کے سرسبز کیمپس پر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ سلاوا نے دیوان سے اٹھ کر فلور لیمپ جلایا، دیوار پر آویزاں ایک شفق رنگ یوکرینی لینڈ اسکیپ اچانک روشن ہو گیا۔ سرخ و سیاہ دھاری دار یوکرینی غالیچے پر آنکھیں موندے بلی اس پولش شوربے کی بوٹیوں کے خواب دیکھ رہی ہے جو نتاشا تیار کرنے میں مصروف ہے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے "رام تھا" نتاشا باورچی خانے سے باہر آ کر کہتی ہے۔ "رام" پچھلے پندرہ برس سے نتاشا کے تخلیق کردہ روسی ڈرامے "رامائن" کا ہیرو ہے۔ نامور انڈولوجسٹ اور انتھروپولوجسٹ اور ماہر لسانیات نتاشا گیسوا کی پردادی ایک پولش کاؤنٹس تھی۔ پولینڈ یوکرین کا پڑوسی ہے۔ ڈاکٹر سلاوا پوٹینکو نتاشا، کا شوہر اور مشہور آرٹسٹ یوکرینی ہے۔ جگ ساپزل کے مختلف ٹکڑے۔

پلنچ کے بعد نتاشا ایک الماری سے پہلے گول رنگین چوبی پٹاری برآمد کرتی ہے۔ پھر بازی گر کی طرح اس میں ایسٹر کے رنگین چوبی انڈے ـــــ پٹاری اور انڈے مخصوص روسی رنگ برنگی فوک آرٹ کی گلکاری سے مزین ہیں۔ "یہ انڈے ایسٹر کے زمانے میں ہماری کسان عورتیں شہر لاکر فروخت کرتی ہیں۔" نتاشا کہتی ہے۔

"اب بھی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اب بھی بطور ایک کلچرل موتیف"

سلاوا دوسرے کمرے سے ایک انگریزی مضمون کا تراشہ لاکر دیتا ہے۔

"یہ حسین کو دیدینا۔ میں نے ان کے متعلق لکھا تھا۔"

حسین ہندو دیومالا اور عراقی شیعہ ایتھوس کی علامتیں پنجے، علم اور گھوڑے اپنے موتیف بناتے ہیں۔ طبلسی اور باکو میں مرصع خنجر اور پستول بک رہے ہیں۔ بطور ان پہاڑی سابق جنگجو قوموں کے کلچر موتیف۔ خالی ہمارے ملک میں کلچر موتیفوں اور ایتھوسوں کے سلسلے میں خون خرابہ ہوتا ہے۔ اُدھر سبطِ حسن اور ڈاکٹر جمیل جالبی اور انتظار حسین اپنے ایتھوس اور کلچر موتیف کی فکر میں غلطاں اور پیچاں ہیں۔

تو یہ مذہبی خون خرابہ مغرب میں بھی ہوتا تھا۔ مگر صدیوں پہلے۔ ایک مرتبہ نوجوان روسی نقاد الونشا زیریف نے ماسکو سے باہر ایک خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے تبلایا تھا کہ سترہویں صدی میں روسی پادریوں کے دو گروہوں کے درمیان بڑا خون خرابہ اسی معاملہ پر ہوا کہ صلیب

کا نشان دُو انگلیوں سے بنایا جائے یا ایک سے۔ سینکڑوں اہلِ ایمان مارے گئے۔

اور یہ داغستان میں مینارِ شہدا استادہ ہے کہ ترکوں نے آرمینوں کا خون بہایا اور داغستان میں زارِ روس کی فوجوں نے قتل عام کیا تھا اور آذربائیجان میں ——

ہزاروں برس قبل اگر برف نہ پگھلی ہوتی تو کیا بُرا تھا؟

نتاشا نے گیلری میں جا کر وارڈروب کھولا۔ اور گرم موزے اور دستانے اور فل بوٹ نکال کر لائی۔ "شمالی علاقوں میں" اس نے کہا "شدید سردی ہو گی۔ ساتھ لے جانا۔"

"اگر برف نہ پگھلتی۔"

میں نے بآوازِ بلند دہرایا۔

"تو تم اور ہم اس وقت یہاں موجود نہ ہوتے" نتاشا نے جواب دیا۔

"آدھی رات کا سورج جیسا سرد ہوتا ہے ایسے ہی وہ رفتہ رفتہ بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا تو زندگی ختم ہو جائے گی۔"

اس نے کہا "مگر اطمینان کی بات یہ ہے کہ اس وقت ہم موجود نہ ہوں گی۔"

"معاف کیجئے گا آپ انتہائی قنوطی گفتگو کر رہی ہیں۔" سلاوا نے اچانک فصیح و بلیغ اردو میں ارشاد کیا۔ میں نے دریچے میں جا کر باہر جھانکا۔ شاندار تناور درخت مینہ کی بوچھاڑ میں مضبوطی سے سیدھے کھڑے تھے۔

"لاکھوں برس بارش ہی ہوا کی۔ ہر کام اللہ میاں نے انتہائی فرصت سے کیا۔" میں نے پلٹ کر اطلاع دی وہ لاکھوں برس ڈینو سار گھومتے پھرے۔ فرض کرو اسوقت اس جنگل سے ایک ڈینو سار زندہ ہو کر نکل آئے اور ان ساری تجربہ گاہوں اور عمارتوں کو روندتا ہوا جنگل میں واپس چلا جائے۔ جنگل ازلی اور ابدی ہے۔ جب برف پگھلی اور جنگل نمودار ہوئے اور ڈینو سار —— جیولوجیکل وقت لاکھوں برس اور مہذب انسان کا تاریخی وقت صرف دس ہزار برس مسخرہ پن ہے۔ صرف آٹھ ہزار سال پہلے یوریشیا کے جنگلوں میں جو سفید فام انسان آباد تھا اسے تم انتھروپولوجی والے "دفن" کہتے ہو۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ انسان والگا کی وادی میں کھیتی باڑی کرتا تھا اور لکڑی کے جھونپڑے بناتا تھا اور سمور اوڑھتا تھا۔"

"ہاں"۔ نتاشا نے کہا "اور اپنے مُردے دفن کرتا تھا اور ان پر تبرک سرخ رنگ چھڑکتا تھا۔"

"تو تمہاری آرین تھیوری کے مطابق کیا یہ آرین سینڈر کا اوریجن تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے" ڈاکٹر نتاشا گیسوا نے کہا۔ اور برستی بارش کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک بک شیلف کی طرف گئی اور ایک انگریزی کتابچہ نکالا۔ "میری تازہ تصنیف ۔ جین فلسفہ"

"جین فلسفہ" میں نے غصے سے کہا "یہاں ابھی اوریجن کے متعلق ہی طے نہیں ہو پایا اور تم جین فلسفہ پر پہنچ گیئں۔ یہ سنہری چوٹیاں گوندھے

چوبی جھونپڑوں میں رہنے والی تمہاری کسان عورتیں جو اپریل میں چوبی انڈے تراش کر انکو رنگتی ہیں یا آٹھ ہزار سال پہلے چوبی مورتیاں بنا کر ان کو رنگ رہی تھیں۔"

"چوبی مورتیاں بھی چار چار سروں اور دس دس ہاتھوں والی" نتاشا نے ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔" بالٹک سلاو علاقے اور یوگوسلاویہ میں ایسی مورتیاں کھدائی میں نکلی ہیں۔ ویدک دیوی دیوتاؤں کی کزن۔ اور یہ قدیم ترین انڈو یوروپین لوگ جنوب مشرق روس کے اسٹیپ یعنی بحیرہ اسود کوہستان قفقاز اور بحیرہ کیپین کے شمالی علاقے میں آباد تھے۔

"روسی یا سلاو اور انڈو آریائی زبانوں کے بعض الفاظ کی مماثلت اسی دور کی یادگار ہے" سلاوا بولا۔

"میرے اجداد اس وقت کہیں صحرائے عرب میں قدیم ترین سامی زبان بولتے پھر رہے ہونگے۔" میں نے کہا۔

"عیسیٰ سے سات سو سال پہلے" نتاشا نے بلی کو گود میں اٹھا کر کہا" ایک نئی التائی یا تورانی قوم سنٹرل ایشیا میں ابھری اور جنوبی روس سے ہنگری تک پھیل گئی۔"

"چنانچہ ہنگری والوں کی ترک تازی دیکھو!" میں نے کہا۔

"ہاں اور جنوبی روس کے قبائل گھوڑوں پر سوار ہو کر ایلام اور وادی سندھ اور دجلہ و فرات کے شہروں پر نازل ہوئے اور بڑی تباہی مچائی۔"

"اس زمانے کے شہر ہی کتنے بڑے تھے"۔ میں نے کہا۔ "نینوا جو اس وقت کا نیویارک تھا اس کی آبادی صرف ستر ہزار تھی۔ ان اجنبی شمالی پیلے ترمنگے لوگوں کی یلغار بڑی دہشتناک لگتی ہو گی۔ اسی لیے میرے عرب عبرانی اب و جد نے تم کو یاجوج ماجوج کہا تھا۔"

ہولی مدر رشا

"یاجوج ماجوج" کی اولاد نے عبرانی روایات کس طرح اختیار کر لیں؛ جگ ساپزل کی ایک اور تصویر۔ ڈاکٹر سلاداپوٹمنکو کی کورٹ اعلیٰ قدیم سلاو نسل نے خانہ بدوشی اور جنگلی جانوروں کا شکار ترک کر کے سب سے پہلے زرخیز یوکرین میں کاشت کاری شروع کی تھی۔ ولادت مسیح کے بعد قرون وسطیٰ تک پہنچتے پہنچتے ڈینپر کے کنارے روستوو اور کیو اچھے خاصے بڑے شہر بن چکے تھے۔ یوکرین بڑا دولتمند علاقہ تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے مغرب کے گوتھ اور فرنیک اپنی فوجیں لے کر اس پر آپڑے اس طرح گویا یوروپین کامن مارکیٹ روسی تاجروں کے لیے کھل گئی۔ اسی زمانے میں ایک ترکستانی قبیلے خزار نے دالگا کے کنارے شہر اتل بسا کر یہودی مذہب اختیار کیا۔ یہودی نژاد مصنف آرتھر کوئیسلر نے اپنی تازہ کتاب میں ثابت کیا ہے کہ روس، یورپ اور

امریکہ کے سارے اشکناز ی یہودی دراصل ان خزر یہودیوں کی اولاد ہیں ۔

جنوبی روس کے امیر کاروباری عموماً نارو ے کے پیشہ ور سپاہیوں کو اپنے گوداموں کی چوکیداری کے لیئے ملازم رکھتے تھے ۔ ایک ذہین نارویجین سردار ریورک نے نارویجین سپاہیوں اور چوکیداروں کی مدد سے ۸۲۲ء میں نووگراڈ اور کیو پر قبضہ کر لیا ۔

یہ شخص ریورک موجودہ ملک روس کا باوا آدم ہے ۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے کمسن بچے کے والی اولیگ نے کیو میں باقاعدہ اپنا دربار قائم کیا ۔ ریورک کے اخلاف میں کیو کا ایک حاکم آرچ ڈیوک ولادی میر اول تھا جو لتھونیا، بلغاریہ اور کرائمیا کو اپنا مطیع کرنے کے بعد کیو میں مزے سے دندناتا تھا اور رُوڈی، سورگ وغیرہ دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کیا کرتا تھا (جن کے ہم وزن رودر اور سورگ وغیرہ ویدک نام تھے)

کہ اچانک اسے ترقی یافتہ مذاہب میں دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ ولادی میر امرائے بخارا آلِ سامان کا ہمعصر تھا ۔ مغرب میں بازنطیم کی عظیم الشان مسیحی سلطنت کا ڈنکا بج رہا تھا ۔ روم اور بازنطیم کے مذہبی تفرقے کو پیدا ہوئے صدیاں گذر چکی تھیں ۔ اہل قسطنطنیہ اور روم کے کلیسا جداگانہ تھے ۔ اور قسطنطنیہ "مشرقی روم" کہلا رہا تھا ۔ (اسی وجہ سے سارا عالمِ اسلام بازنطیم کو "روم" کہتا تھا) مسلمان صوفیاء اور عرب و عجم

کے تاجر کنارِ والگا کے بلغاریوں کو کلمہ پڑھا چکے تھے۔ بازنطینی اور یونانی تاجر اور خزار یہودی کیو میں موجود تھے۔ ذہین ولادی میر کو ان غیر روسی اجنبی مذاہب کی کرید لگ گئی۔

اٹل اور کیو کی مساجد میں بعد نمازِ جمعہ بلغاریوں اور غیر ملکی مسلمان تاجروں اور مولویوں تک خبر پہنچی کہ بت پرست آرچ ڈیوک اپنے آبائی مذہب سے برگشتہ ہو چکا ہے۔

چند مولوی صاحبان فوراً کیو کے دربار میں پہنچے۔ روسی سردار کو جو انکے خیال میں نوح علیہ السلام کے فرزند یافث کی اولاد اور یاجوج ماجوج کی نسل سے تھا، فوراً دعوتِ اسلام دی۔ ولادی میر نے اس مذہب کے متعلق سوالات کیے۔ کلمہ پڑھنے کے لیے تیار ہوا۔ مگر سنّت ابراہیمی کے اتباع، لحم خنزیر اور ووڈکا سے اجتناب کی شرائط پر بدک گیا (سینٹ پال انطاکیہ سے آگے جا کر سنت ابراہیمی لحم خنزیر اور شراب نوشی کی عبرانی روایات کو مسترد کرنے کے بعد ساری رومن ایمپائر یعنی یوروپ کو کب کے عیسائی کر چکے تھے)

علمائے دین مایوس ہو کر واپس گئے۔ اب یہودی ربائیوں کا ایک وفد صحیفہ توریت سنبھالے دربارِ کیو میں وارد ہوا مگر وہی سنّت ابراہیمی کا اتباع اور لحم خنزیر سے اجتناب۔ ولادی میر نے اکتا کر یہودیوں کو بھی رخصت کیا۔ اب بازنطینی یونانی پادری عیسےٰ و مریم کا جگمگاتا بازنطینی آئیکن اٹھائے جلوس کی صورت دربار میں داخل ہوئے۔ بے چارہ

ولادی میر مسلمان اور یہودی مبلغین کی کڑی شرائط سے اسقدر خائف ہو چکا تھا کہ اس نے پادریوں کی تقریر کو دھیان سے نہیں سنا۔ مزید براں وہاں ایک ہی خدا تھا یہاں تین تین۔ اور وہی جنت وجہنم گناہ و ثواب جزا و سزا۔

"پیارے بیٹے یسوع تمہارا منجی ہے" پادری نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر تمہارے مذہب میں داخل ہونے کا MODUS OPERANDI کیا ہے"؟

"صرف مقدس پانی کے چند چھینٹے—"

"اور کچھ نہیں؛ آر یو شیور— ؟(یہ اس نے روسی زبان میں پوچھا تھا)

ولادی میر کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے عیسائیت کے بالکل صحیح صحیح کوائف معلوم کرنے کے لیے اپنا سفیر کیو سے قسطنطینہ روانہ کیا۔

یہ واقعہ ۱۰۹۹ء کا ہے۔

روسی سفیر کا وفد بازنطینی چرچ کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب و متاثر ہو کر کیو واپس آیا۔ چنانچہ آرچ ڈیوک ولادی میر اول نے گریک اور تھوڈوکس چرچ کی رسوم کے مطابق بپتسمہ حاصل کیا۔ (کلیسا نے قسطنطینہ کے حریف پاپائے روم کو یہ اطلاع ملی۔

وہ بہت مایوس ہوئے کہ وہ خود اس وسیع اور دولتمند ملک روس

کے فرمانروا کو اپنے چرچ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔)

بعد ازاں، ولادی میر نے ایک بازنطینی شہزادی سے بیاہ رچایا۔ اور ایسا پکا عیسائی ثابت ہوا کہ مرنے کے بعد بازنطینی اسے باضابطہ ولی قرار دیا اور اب وہ سینٹ ولادی میر کہلاتا ہے۔

جب ولادی میر بازنطینی عیسائی ہوا اس روز سے مادرِ روس نے اپنا رخ روم اور مغرب کی طرف سے موڑا اور بازنطیم اور مشرق سے اپنا روحانی اور تہذیبی ناتہ جوڑا۔ یہ صورتِ حال ایک ہزار سال بعد آج بھی تقریبا ویسی ہی موجود ہے۔

ولادی میر عیسائی ہوا اس کی روسی رعایا بھی دھڑا دھڑ بپتسمہ حاصل کرنے لگی۔ کیو میں دریائے ڈنیپر کے کنارے گھنے درختوں کے درمیان ایک بہت اونچا مجسمہ ولادی میر کا استادہ ہے۔ ہاتھ میں صلیب لیے اس جگہ وہ اپنی رعایا کو قدیم مسیحی رسم کے مطابق دریا میں ڈبکیاں لگوا لگوا کر بپتسمہ دلواتا تھا۔ ولادی میر کے عہد سے سارے ملک میں حسین ترین گرجا اور خانقاہیں تعمیر کی گئیں۔ طلائی فریموں والی ہیروں سے مرصع مذہبی تصاویر (ICONS) سے ان عبادت خانوں کو ایسا سجایا کہ رومن کیتھولک یورپ میں انکا کوئی ثانی نہیں۔

ریورک کی اولاد اب ایک عرصے سے روس کی حاکم تھی۔ مگر تاتاری اور روسی دستور کے مطابق ایک سردار کے مرنے کے بعد ریاست اس کے سارے بھائی بھتیجوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ لہٰذا مسلسل حصوں

مجزوں اور وراثت کے قضیوں کیوجہ سے کیو کی حکومت کمزور پڑتی گئی۔ اور بآسانی منگولوں کے قبضے میں آگئی۔

۱۱۵۴ء میں یوری ڈولگورکی کیو کا آرچ ڈیوک بنا۔ اس کے لڑکے نے شہر ولادی میر بسایا۔ اس کی مملکت کی آبادی زیادہ تر شمالی فِن قبائل اور نووگراڈ کے باشندوں پر مشتمل تھی۔ بارہویں صدی میں یوریشِن تاتار سے بچنے کے لیے وادی ڈینپر کے باشندے اس طرف آن بسے ان سب نے آپس میں شادی بیاہ کیے۔ اور روہ روسی قوم پیدا ہوئی جو سارے یوروپین روس میں پھیلی۔

یہ بڑی ذہین، بہادر، جفاکش، آرٹسٹک اور نفاست پسند قوم ثابت ہوئی۔ ۱۱۴۷ء میں یوری ڈولگورکی نے ماسکو آباد کیا۔ ہر شہر میں یوری نے پہلے ایک خوبصورت طلائی یا نقرئی پیانہ نما یا زیلطینی گنبدوں والا گرجا تعمیر کروایا۔ ۱۱۵۸ء میں شہر ولادی میر کے لیے مریم و بیلسے کا وہ آئیکن تیار کیا گیا۔ جو ساری دنیا میں OUR LADY OF VLADIMIR کے نام سے مشہور ہے۔

ماسکو ایک تجارتی منڈی کی حیثیت سے آباد ہوا تھا۔ آرچ ڈیوک کے خاندان نے منڈی کے قریب اپنی رہائش کے لیے ایک کریملن یعنی قلعہ اور اس کے احاطے میں عالیشان عبادت خانے بنوائے۔ قلعے کی فصیل کے نیچے ماسکو دریا بہہ رہا تھا۔ سامنے منڈی کا چوک تھا (وہ چوک آج ریڈ اسکوائر ہے)

خوانین اردوئے مطلا

ابھی یہ ماسکو ایک چھوٹی سی بستی تھی جب ۱۲۲۷ء میں خان اعظم چنگیز خان کا انتقال ہوا۔ اس کی وسیع سلطنت اس کے چاروں بیٹوں اوغتائی، چغتائی، جوجی اور طولوئی میں تقسیم کی گئی۔ اوغتائی اور اس کے اخلاف چین کے خاقان اعظم کہلائے۔ چغتائی، جوجی خان، طولوئی اور ان کی آل اولاد نے منگولیا۔ سائبیریا، وسط ایشیا، ایران، کرائمیا، بلغاریہ وغیرہ وغیرہ کی بادشاہتیں سنبھالیں۔ جوجی خان کے بیٹے باتو خان نے وادی والگا میں ریاست کازان قائم کی اور اردوئے مطلا GOLDEN HORDE کا خان اعظم بنا۔

منگولوں نے جنہیں اب تاتاری کہا جا رہا تھا، اسلام قبول کیا

اور روس پر تین ۳ سو برس حکمران رہے۔ مسکوی یعنی ماسکو کے گرینڈ ڈیوک ان کے کمزور باجگذار تھے۔ اور بطور خراج اپنی شہزادیاں منگول خواتین کی خدمت میں شہر سرائے بھیجتے تھے جو والگا کے کنارے اردوئے معلّا کا زبردست دارالسلطنت تھا۔ مستقبل بعید کا اسٹالن گراڈ، اور اُسکے بعد والگوگراڈ تاتاریوں نے شمالی روس سے لے کر وادئ سیحول وجیحوں تک شاندار مساجد، مدارس، مقابر اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ روسی نو عیسائیوں کا منبع فنِ یونان و بازنطیم تھا۔ جس نے "روسی بازنطینی" فنِ تعمیر اور آرٹ کو جنم دیا۔ تاتاری نومسلموں کا آئیڈیل ایران جس نے "تاتاری ایرانی" طرزِ تعمیر اور آرٹ کی تخلیق کی۔

ازبک خان جو ۱۳۱۳ء سے لے کر ۱۳۴۰ء تک اردوئے معلّا کا خان اعظم تھا اور جس کے نام پر ایک پوری قوم ازبک کہلائی، روسی کلیسا کے اسقفِ اعظم پیٹر کو مندرجہ ذیل چارٹر روانہ کرتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

ازبک کی جانب سے اس کے تمام مختلف المراتب شاہزادوں کے نام:۔
واضح ہو کہ کوئی شخص اس کلیسا کی توہین نہیں کر سکتا جسکا اسقف پطرس ہے، مابدولت اعلان کرتے ہیں کہ ہم، ہماری اولاد، اور اولاد کی اولاد، اور ہماری سلطنت کے شاہزادگان اور ہمارے صوبجات کے حکام اعلیٰ، کلیسا اور اس کی وسیع جائداد اور اوقاف کے معاملات میں کبھی مداخلت نہ کرینگے"

خواتین سرائے کے ترک رشتے دار آمو دریا سے لے کر ڈینیوب تک پھیل چکے تھے۔ انہوں نے اناطونیہ، ایشیائے کوچک (جو ان کی وجہ سے اب ترکی کہلا رہا تھا) اور آذربائیجان اور آرمینیہ اور ایران اور شمالی ہندوستان اور وسط ایشیا میں اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ ۱۴۹۲ء میں ترک سردار عثمان بے کی اولاد سلطان محمد نے قسطنطنیہ فتح کیا اور محمد فاتح کہلایا۔ دولتِ عثمانیہ بازنطیم کی وارث ریاست بنی اور "روم ثانی" یعنی قسطنطنیہ کے زوال کے بعد ماسکو نے بازنطیم کے روحانی وارث کی حیثیت سے "روم ثالث" کا لقب اختیار کیا۔

سارے روسیوں کا زار

روس کے تاتاری مسلم حکمرانوں کے انحطاط کے ساتھ ساتھ ماسکو کے آرتھوڈکس طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔ اب وہ "زار" یعنی بادشاہ کہلانے لگے۔ مغرب کے تاریخی عوامل کے دھاروں سے علیحدہ، "مقدس سلطنت روس" اور "ہولی مدر رشا" اپنا ڈیڑھ اینٹ کا گرجا الگ بنائے یورپ کے ریفارمیشن، نشاۃ ثانیہ، صنعتی انقلاب سے بے بہرہ اور غیر متاثر رہی۔ مغرب میں پارلیمنٹیں اور نمائندہ حکومتیں ظہور میں آ رہی تھیں۔ یہاں انواع و اقسام کے زاروں کی ریل پیل تھی۔ سائبریا اور استراخان اور کریمیا کے مسلمان بادشاہ بھی زار کہلاتے تھے اور سب ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے تھے۔ بالآخر مسکوی کے زار سب سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔

ایوان چہارم (جو خونناک کہلاتا ہے) نے ۱۵۵۲ء میں کازان کی ہمسایہ مسلمان ریاست پر قبضہ کیا۔ پولینڈ کو شکست دی اور "تمام روسوں کے زار" CZAR OF ALL THE RUSSIAS کی حیثیت سے ماسکو کریملن میں دھوم دھام سے اس کی تاجپوشی ہوئی۔

۱۶۱۳ء میں زار مائیکل فیودورچ نے رومنوف شاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ مائیکل کا غیر معمولی بیٹا پیٹر جدید ریاست روس کا بانی ہے۔

پیٹر اعظم نے ماسکو سے مرکز حکومت سینٹ پیٹرزبرگ منتقل کرنے کے بعد ایک طاقتور بحریہ تیار کیا۔ دریائے ڈون کے کنارے آباد عثمانی ترکوں کے فوجی مستقر ازوف پر قبضہ جمایا اور مغرب سے پروفیسر، سائنیداں اور اور ماہرین فنون روس بلوائے۔

روس ایک نیم مشرقی معاشرہ تھا۔ تاتاری مسلم تسلط اور مسلم سماجی ماحول کے اثر سے روسی عورتیں نیم پردے میں رہتی تھیں۔ مرد لمبی داڑھیاں رکھتے تھے۔ پیٹر نے مردوں کی داڑھیاں زبردستی منڈوائیں۔ عورتوں کو باہر نکالا اور حکم دیا کہ یوروپین طور طریقے اختیار کریں۔ وہ پہلا روسی زار ہے جس نے EMPEROR OF ALL THE RUSSIAS کا لقب اختیار کیا۔

ڈیوک سے آرچ ڈیوک پھر زار۔ پھر ایمپرر۔

پیٹر اعظم وہ زار تھا جس نے ملک کو یوروپین علوم اور عقلیت پرستی سے روشناس کراکے اپنے وطن کی تقدیر بدل ڈالی۔ ۱۷۲۵ء میں وہ مرا۔ اس وقت ہندوستان کی سلطنتِ مغلیہ اور سلطنتِ ایران اور مغرب میں

دولتِ عثمانیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اور اقوامِ یورپ کا عروج۔
پیٹر کے بعد روس کی دوسری زبردست حکمراں ایک عورت تھی۔
کیتھرین دوئم۔ اس نے سلطان ترکی سے ٹکر لی جو اس وقت تک بحر و بر
پر روس کا سب سے زیادہ طاقتور اور عظیم المرتبت حریف تھا۔ سولہویں
اور سترہویں صدی میں عثمانی بحریے کی طاقت اور اقتدار کا یہ عالم تھا
کہ ترک بحیرہ روم کو ایک معمولی ترکی جھیل تصور کرتے تھے۔ اور انگلستان
اور یوروپ کے حکمرانوں کے درباروں میں اپنے سفیر تعینات کرنا اپنی
کسرِ شان سمجھتے تھے۔ بحیرہ روم انکا تھا۔ بحیرہ اسود۔ خلیج فارس۔
بحیرہ احمر۔ ایک تہائی یوروپ۔ ایران کے سوا سارا مغربی ایشیا۔
اور سارا شمالی افریقہ۔

لیکن قسطنطنیہ اور قاہرہ اور دمشق اور بغداد اور ٹیونس اور بلغراد اور
صوفیہ اور ترانہ اور بخارسٹ میں پیرس اور اوکسفرڈ اور کیمبرج اور برلن کی
طرز کی جدید یونیورسٹیاں اور تجربہ گاہیں قائم نہیں کی گئی تھیں۔ یوروپین
نشاۃ ثانیہ میں ترکوں کا کوئی حصہ نہیں۔ انجام ظاہر ہے۔

ایک خونریز جنگ کے بعد زارینہ کیتھرین نے بابِ عالی سے بحیرہ اسود
میں جہاز رانی کے حقوق حاصل کیے (اس تاریخ سے ترکیہ کا انحطاط شروع
ہوتا ہے) بعد ازاں اس باجبروت ملکہ نے کرائیمیا اور ڈون وا لگا کے
علاقے کے مسلمان خوانین کی وسیع اور متمول ریاستیں ان سے چھین
کوہستان قفقاز کی مسلم ریاستوں میں روسی اثر بڑھایا۔ کریمیا کی حکومت

جوجی خان ابن چنگیز کے سب سے چھوٹے لڑکے تغا تیمور کی اولاد کے قبضے میں رہی ان میں سے ایک سردار الغ محمد نے حکومت کازان کو ماسکو کے پڑوس میں ایک طاقتور ریاست بنا دیا تھا (جسے خونناک ایوان چہارم نے ختم کیا) الغ محمد کے پوتے زار قاسم نے ریاست کازیموف کی بنیاد ڈالی۔ (قاسم سے قاسموف یا کازیموف) مسلم حکمرانوں کی ایک دوسرے سے تباہ کن جنگیں تاریخ اسلام کا خاصہ ہیں۔ روس کی یہ ساری مسلمان حکومتیں بھی ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہ کر برباد ہوئیں۔ خوانین کازیموف خوانین کازان سے لڑا کیئے اور وہ سب ایک دوسرے کے خلاف ماسکو کا ساتھ دیتے تھے۔ ۱۶۷۸ء میں کازیموف بھی مسیحی روس میں جذب کر لیا گیا۔

الغ محمد کے بھائی تاش تیمور نے کریمیا کی وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ کریمیا روس اور سلطنت ترکی کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ تھا۔ ترکی اسے اپنی سرحدی چوکی بنانا چاہتا تھا۔ مگر سلاطین کریمیا ۱۷۸۳ء میں سینٹ پیٹرزبرگ سے بھی سانہ بانہ کر رہے تھے۔ ۱۷۸۳ء میں کیتھرین اور بابِ عالی کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے کریمیا کی آزاد مغلیہ حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ زار شاہین گرائی کرائیمیا کا آخری مسلمان تاجدار تھا۔ کرائیمیا سلطنت کو روس میں شامل کر لیا گیا۔

مملکت ازبک اور خاندان شیبان یعنی سائبیریا اور ماوراالنہر کی تاتاری حکومتوں کا تختہ زار شاہی روس نے انیسویں صدی میں الٹا اور مزید جنگیں لڑ کر بیس اربیا، مولدیویا، رومانیہ، مشرقی آرمینہ وغیرہ خلیفۃ

المسلمین سلطان ترکی سے اور جارجیا، اور آذربائیجان ایران کے شاہانِ
قاچار سے چھین لیے۔ اب انہیں ڈھونڈ ــــــ الخ

روس اب تک بااقتدار وسیع امپریل طاقت بن چکا تھا۔ ایک
کٹر اور طاقتور کلیسا، مطلق العنان زار، جابر زمیندار مظلوم اور نیم غلام
کسانوں کے اس معاشرے نے روس کی اس غمگین " dark and
bloody " روح کو جنم دیا جس نے ایک عظیم الشان ادب تخلیق کیا
کہ "معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود"

ایشیا میں امپریلزم کی بساط پر روس اور برطانیہ اب ایک دوسرے
کے زبردست حریف تھے۔ جنرل کاف مین ہندوستان پر حملے
کا منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت بھی
روسی ایجنٹوں نے کروائی۔ سنٹرل ایشیا پر روس کے قبضے کے
بعد روس ریچھ مرو تک پہنچ گیا تھا اور لارڈ نارتھ بروک، سیلسبری،
کرزن، لٹن سمیت سارے برطانیہ کے مدبروں اور انڈین گورنمنٹ کو
خدشہ تھا کہ درۂ خیبر کے ذریعے ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔
اس وجہ سے دوسری اینگلو افغان جنگ لڑی گئی کہ امیر کابل شیر علی
روسیوں کا اثر اپنے ہاں نہ بڑھنے دیں۔ ۱۸۷۰ء میں ولادی میر ایلچ
لینن کنارِ وولگا کے شمالی تاتاری علاقے کے ایک خوابیدہ شہر
میں پیدا ہوا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں وولگا کے کنارے دشتِ قپچاق میں

ازبک قوم کا ظہور ہوا تھا۔ (انکے سردار شیبانی خان ازبک نے ماورالنہر کی سلطنتِ تیموریہ کو فتح کیا تھا جس کے بعد ازبک لوگ ترکستان میں آکر بسے) تو مرزا غالب کے اجداد اسی دشتِ قپچاق میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے۔ جب ازبکوں کو زارِ روس کے جنرل کاف مین نے تاشقند و سمرقند و بخارا میں مطیع کیا ہے مرزا غالب نے کہ اردوئے معلّٰی کے خانِ اعظم تھے، تسخیر سمرقند و بخارا کی خبر ضرور خراب آباد دلّی کے اردو اخباروں میں پڑھی ہوگی۔ مارچ ۱۸۶۸ء میں بخارا کے امیر مظفرالدین نے روس کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور ناکام رہے۔ اہلِ مغرب ۱۸۵۷ء میں برطانیہ کے خلاف اہلِ دلّی و لکھنؤ کے اعلانِ جہاد کا حشر دیکھ چکے تھے (۱۸۷۳ء میں جنیوا کا فیصلہ ہوا۔ جنرل کاف مین کے صلحنامے پر سیّد محمد رحیم خان امیر خیوا نے لکھا کہ وہ شہنشاہ روس کا ایک ادنی ملازم ہے)۔

ہندوستان اور آبائی وطن ترکستان کے یہ انقلابات دیکھنے اور ان کے متعلق سننے کے بعد اس مغل بچے نے جسکا نام مرزا اسداللہ خاں غالب تھا شاہجہان آباد میں رحلت کی۔ سو برس بعد اس کی "صدی" دھوم دھام سے ہندوستان، پاکستان اور مرزا کے آبائی شہر سمرقند میں منائی گئی۔ اسی گہما گہمی کے کچھ عرصے بعد پہلی بار جانا راقم الحروف کا ملک روس ہوا۔

اُفق تا اُفق

جون ۱۹۶۹ء - کہرے کے نیچے سے ہرات گذر گیا۔ بلخ۔ مرو۔ بدخشاں
ترمذ۔ کوہستان پامیر پر بادل نازک سے گذر رہے ہیں۔ چینی واٹر کلر
کی طرح۔ ڈون قزاقوں اور قرا قلی پوش ترکمان شہسواروں اور سمور
پوش سائبیرین شکاریوں سے بھرے گھنے جنگلوں اور سبزہ زاروں
کے اوپر سے گذرتے ہوئے سکوت اور وسعت کا احساس۔ کتنی وسعت
نہ اور نہ چھور۔ شمال میں سردی پڑ رہی ہے جنوب میں موسم بہار آ چکا۔
مشرقی روس میں جس وقت سورج نکلتا ہے وہی مغربی سوویٹ یونین
میں غروب آفتاب کا وقت ہے۔ اور ایک سَو سے زیادہ اقوام اور اتنی
ہی زبانیں۔ افق تا افق شفاف نیلا آسمان زمردیں اور سیاہ زمین۔ خوشگوار

بھیڑیوں سے پُر گھنے جنگل ۔ عظیم دریا ۔ سب اس لرزہ خیز بے آواز پھیلاؤ میں گم ۔

گھنے سرسبز جنگلوں سے گھرا ماسکو ۔ نیچے چمکیلے دریا پر ایک روکٹ کشتی زن سے نکل گئی ۔ فوجی جیٹ طیاروں کا ایک جوڑا اپنی لکیریں چھوڑتا آسمان کی نیلاہٹ میں غائب ہو رہا ہے ۔

انٹرنیشنل ایرپورٹ سے لے کر شہر تک شاہراہ کے دونوں طرف صنوبر اور برچ اور سفیدے اور شاہ بلوط کے جنگل ۔ راستے کے کنارے جنگ سے پہلے کے چوبی کاٹیج اور داچا ۔ پھر جدید رہائشی بلاک ۔ خاموش وسیع شہر ۔ چوڑی خاموش سڑکیں تجارتی اشتہارات ، بھیڑ بھڑکا شور مفقود گویا سینما اسکوپ پر ایک سائیلنٹ فلم ۔

گورکی اسٹریٹ ۔ شعراء اور ادباء کے مجسمے فرنیچ وضع کی عمارات جدید ترین ہوٹل روسیہ ۔ سامنے ریڈ اسکوائر بے حد پر سکون گھریلو سا وسیع چوک ۔ جو کریملین کی سرخ فصیل کے نیچے پھیلا ہوا ہے ۔ ایک طرف سینٹ باسل کا رنگین گنبدوں والا فینٹسی سا گرجا ۔ جو ہوٹل روسیہ کے مقابل میں بالکل کرسمس کارڈ معلوم ہوتا ہے ۔ ہوٹل کے نیچے ماسکو دریا پر سے روکٹ کشتیاں گذر رہی ہیں ۔ ہر منزل پر مستعد فلور مینیجر خواتین اور کیفے ٹیریا ۔ روم سروس مفقود ۔ کیفے ٹیریا کے کاؤنٹرز پر بچوں کی گنتی سیکھنے والے منکوں کے فریم ۔ کاؤنٹر والی عورتیں منکے ادھر ادھر سے سرکا کر قیمت بتاتی ہیں ۔ جانے یہ کیا چکر ہے ۔ بغیر دودھ کی چائے جو چاد

ہی کہلاتی ہے؟

ہوٹل کے وسیع و عریض پلیٹ گلاس پکچر ونڈوز میں سے کریملن اور ریڈ اسکوائر سینما اسکوپ اسکرین پر ایک کلوز اپ کی طرح سامنے موجود۔ امریکن سیاح کریملن کی تصویریں کھینچنے میں مصروف اور اسٹالن اور جان فارسٹر ڈلز اپنی اپنی قبروں میں کروٹ بدلتے ہیں۔

ماسکو پر ماہِ جون کی پرسکون دھوپ ہے۔ فضا میں شاہ بلوط کی روئیں دار کلیاں برف کے گالوں کے مانند اڑتی پھر رہی ہیں۔ ہوٹل میں اور سڑکوں پر منی اسکرٹ پہنے اسمارٹ اور فیشن ایبل روسی لڑکیاں۔ روسی ٹریکٹر ڈرائیور عورت کے روایتی تصور سے مختلف۔ ریڈ اسکوائر میں اہل شہر اور غیر ملکی سیاح اور دوسری جمہوریتوں سے آئے ہوئے لوگ ٹہلتے پھر رہے ہیں۔

لینن کے مقبرے کے سامنے طویل قطار۔ سنگِ سرخ کا چوکور مقبرہ کریملن کی دیوار کے نیچے استادہ ہے۔ زائرین کی یہ قطار صبح سے شام تک موجود رہتی ہے ایک غیر ملکی دوست نے بتایا کہ انہوں نے ایک بار ایک بوڑھے روسی کسان جوڑے کو تابوت کے پاس سے گزرتے ہوئے صلیب کا نشان بناتے دیکھا۔

کل ایک نیا نیا بیاہا جوڑا کسی پیلس آف ویڈنگ سے آکر زائرین کی قطار کے پاس پہنچا لوگوں نے جو گھنٹوں سے کیو میں کھڑے تھے انہیں بخوشی آگے جانے دیا۔ دونوں نے مقبرے کے بیرونی چبوترے پر جہاں

گلدستوں کا انبار موجود تھا اپنا گلدستہ چڑھایا اور ٹیکسی کی طرف واپس بھاگ گئے۔ دولہا دلہن کا لینن کے مقبرے پر گلدستہ چڑھانا قومی فریضہ ہے۔ روسی پولیس افسر اور زائرین ہم تین ہندوستانیوں کو تپاک سے آگے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ قطار کی طویل لکیر گم ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے سامنے سے شروع ہو کر روسی میوزیم کا چکر کاٹتی کریملن کے بڑے پھاٹک کے سامنے سے گذرتی مقبرے تک پہنچتی ہے۔

مقبرے کے دروازے پر نیلی وردیوں میں ملبوس بالکل ہمشکل دو نوجوان سپاہی ساکت وصامت بت بنے کھڑے ہیں۔ ریڈ اسکوائر کے سارے ہجوم کی نظریں کریملن کے گھنٹہ گھر پر جمی ہوئی ہیں۔ صبح کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ ہر ایک گھنٹے بعد یہ دونوں لڑکے مشین کی سی سرعت سے دوسرے دو پہریداروں کو جگہ دیتے ہیں دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ گارڈ کب تبدیل ہوئی۔ اس منظر کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ کریملن بریگیڈ کے اس دستے کو خاص ٹریننگ دی جاتی ہے۔ چلّے کے جاڑے اور برفباری میں بھی رات کے ہر گھنٹے پر گارڈ اسیطرح تبدیل ہوتی ہے۔ دورانِ جنگ میں بھی اس رسم میں ایک منٹ کا فرق نہ آیا۔

جوں ہی گھنٹہ گھر کی سوئی ساڑھے گیارہ پر پہنچی دو فوجی افسر لیفٹ رائٹ کرتے اپنے کمانڈر کی قیادت میں مقبرے کے بائیں جانب سے نمودار ہوئے۔ مارچ کرتے سیڑھیاں چڑھے۔ اور پلک جھپکتے میں وہ دونوں

دروازے پر اس طرح سنگینیں اٹھائے بت بنے کھڑے تھے۔ اور پہلے والے دونوں لڑکے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ یہ دونوں بھی ہم شکل تھے اور ایک ساقد۔ کمال ہے واقعی۔

مقبرہ کے اندر سنگِ اسود جھلملا رہا ہے۔ مکمل خاموشی۔ گیلریوں میں اس طرح بت بنے فوجی پہریدار۔ تہ خانے میں ایک شیشے کے بکس میں ہیں لینن۔ باقاعدہ سوٹ پہنے۔ زائرین قطار اندر قطار پاس سے گزرتے دوسرے دروازے سے باہر آجاتے ہیں۔ تابوت کے چاروں کونوں پر چار فوجی اٹنشن کھڑے ہیں۔

مقبرے کے باہر کریملن کی دیوار سوویٹ مشاہیر کا قبرستان ہے۔ جب اخباروں میں پڑھتی تھی کہ فلاں فلاں سوویٹ ہیرو یا لیڈر کا انتقال ہوا اور اسے کریملن وال میں دفن کیا گیا تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دیوار میں کس طرح دفن کرتے ہوں گے۔ یہ عقدہ اب جا کے کھلا۔ کرتے یوں ہیں کہ متوفی کی راکھ کا مرتبان کریملن کی دیوار کی چند انیٹیں نکال کر اس میں رکھ دیتے ہیں اور پھر اسے بند کر کے اوپر نام کی تختی لگا دیتے ہیں۔ وہیں پہلے خلائی انسان جوانمرگ یوری گاگارن کی تختی لگی تھی۔ دیوار کے نیچے سرو کے درختوں کے سایے میں باقاعدہ قبریں تھیں ان میں سے ایک قبر آنجہانی اسٹالین کی تھی۔ دیوار کے نیچے بھی ڈھیروں پھولوں کی ٹوکریاں اور گلدستے رکھے تھے اور قبروں پر بھی اِلّا اسٹالین کی قبر کے جو سنسان پڑی تھی۔ مگر اس پر بھی کسی بگڑے دل نے ایک

گلدستہ رکھدیا تھا۔ اسٹالین اندر لینن کے برابر ایک بلوریں تابوت میں خوابیدہ تھے بعد زوال ان کو مقبرہ بدر کیا گیا۔

کریملن کے پہلو میں شاہی باغ ہے جس میں زار لوگ ٹہلتے تھے اب جنتا ٹہل رہی ہے اور آئیس کریم کھا رہی ہے۔ یہیں قلعے کی فصیل کے نیچے سنگِ مرمر کے وسیع چبوترے پر ”ابدی شعلہ“ فروزاں ہے اور مرمریں کتبوں پر ”لینن گراڈ“ ”اڈیسہ“ ”والگوگراڈ“ ”کیو“ اور دوسری HERO CITIES کے نام کندہ ہیں جن کے لاکھوں شہری نازی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ لوگ آتے ہیں خاموشی سے کسی ایک کتبے کے نزدیک گلدستہ رکھ کر چلے جاتے ہیں۔

”آج کیا قومی شہدا کی یاد منانے کا دن ہے؟“ میں نے اپنی ترجمان لیوبا سے پوچھا۔

”نہیں لوگ سال بھر روزانہ پھول لاتے رہتے ہیں ہر روسی کنبے کا کم از کم ایک فرد جنگ میں کام آیا ہے۔ ان سب لوگوں کا کوئی نہ کوئی عزیز ان شہروں میں سے کسی ایک دفاع میں شہید ہوا ہوگا۔“

شاہی باغ میں ہر فرد و بشر آئیس کریم کھا رہا ہے۔ ساری روسی قوم ہمہ وقت یا آئیس کریم کھاتی ہے یا ثقیل کتابیں پڑھتی ہے۔

کریملن کے اندر گرجاؤں میں امریکن سیاحوں کا ہجوم۔

باہر ایک فصیل کے نیچے ایوینو کے برابر ماسکو دریا بہہ رہا ہے۔ اس پار عین مقابل میں برطانوی سفارت خانہ۔ جیمز بونڈ کے لیے آئیڈیل لوکیشن۔

سوویٹ رائیٹرز یونین جس محل میں واقع ہے وہ ٹالسٹائی کے
جنگ اور امن والے کاؤنٹ راسٹوف کا مکان تھا۔ اس کے پڑوس میں رائیٹرز
یونین کلب کی عمارت انقلاب سے قبل فری میسنری کی گرینڈ لاج تھی۔ روسی
زبان کے مترجموں کی بین الاقوامی کانفرنس اسی عمارت میں ہو رہی ہے۔
پوچھئے آپ کہاں کی روسی مترجم ہیں تو اسکا ماجرا یوں ہے کہ چند سال قبل
مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے چند روسی ناولوں میخائیل شولوخوف وغیرہ کے
انگریزی ترجمے بھیجے تھے کہ ان کو اردو میں منتقل کر دیجئے۔ کر دیئے۔ اچانک
ایک روز ماسکو سے اطلاع ملی کہ آپ کو سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ دیا
جائے گا۔ برائے تراجم اور اس کے ساتھ روس کی سیر۔ جہاں چاہیئے
جایئے۔ ہم نے کہا ضرور جائیں گے۔ لہٰذا آ گئے۔ مع ملیالم اور گجراتی کی
ایوارڈ یافتہ شاعر اور ادیبہ مسٹر نمبودری اور مسز جیا ٹھاکر جو احمدآباد کے
کسی کالج میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ سیدھی سادی ہاؤس وائف۔
ذرا اونچا سنتی تھیں۔ روس کا دوسرا سفر تھا مگر مستقل حواس باختہ رہتی
تھیں شری نمبودری ایک معمر اسکول ٹیچر روس کی ہر چیز پر عش عش
کر رہے تھے۔ ہوٹل روسیہ کے ایک طعام خانے میں بھائی نمبودری ایک
روز لحم گاؤ کھاتے نظر آئے میں نے سمجھا شاید انکو معلوم نہیں آگاہ کیا۔
مختصراً جواب دیا۔ "کمیونسٹ گائے ہے۔"

مسٹر نمبودری بعض دفعہ بڑی المناک باتیں کرتے تھے۔ وہ ایک غریب
مدرس تھے اور پہلی مرتبہ اپنے صوبے کیرالا سے باہر نکلے تھے۔ ایک شام

ہوٹل ماسکو میں نمبودری صاحب نے بڑے ٹھاٹھ سے بیرّا کو حکم دیا "میرے لیے شمپین منگواؤ۔ میں نے ساری عمر انگریزی لٹریچر میں شمپین کا تذکرہ پڑھا ہے۔ چکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں کیسی ہوتی ہے"؟

والگا بوٹ مین کا گیت

کانفرنس میں چونتیس[۳۴] ممالک کے ایک سو بیس[۱۲۰] ادبا و مترجمین مع برطانیہ فرانس، اٹلی وغیرہ کے نمائندوں کے۔ یہ لوگ سب روسی کلاسیکس اور احمدوا۔ شولوخوف، یودتیشنکو اور وزنیشگی کے اپنے ہاں ترجمے کرتے ہیں۔ ماسکو سے الیانوسک جاتے ہوئے طیارے میں نیویارک کی ایک روسی نژاد پبلشر خاتون جسکا ادارہ صرف روسی تراجم شائع کرتا ہے نارو بجین سے بزبان فرنچ معروف گفتگو ہیں۔ میرے برابر بیٹھی سلور گرے بالوں والی ایک بی بی انگریزی میں مجھ سے اپنا تعارف کراتی ہیں "میرا نام کلارا کسوچ ہے بوڈاپسٹ میں میری والدہ اور امرت شیر گل کی ماں بچپن کی ہمجولیاں تھیں۔"

کلارا کے خسر جنگ سے قبل سے پیرس میں آباد ہو چکے ہیں۔ ان سے

ملنے وہ ہنگری سے اکثر فرانس جاتی رہتی ہیں۔ اور روسی، فرنچ اور انگریزی روانی سے بولتی ہیں۔

ہم جنوب مشرق کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ جہاں خوانین چغتائیہ کی سرزمین پر سے بہتا ہوا عظیم والگا بحر خزر کی طرف رواں ہے اس کے ایک کنارے پر شہر سرائے واقع ہے۔ اور دہانے پر استراخان۔ مغل دنیا میں کہاں کہاں نہیں پہنچے۔ اور پھر صفحۂ ہستی سے ایکدم غائب۔

الیانوسک کے مضافات میں یکساں وضع کے رہائشی بلاک۔ سب کی بالکنیاں تیز نیلے بھدے رنگ میں رنگی ہوئی۔ یہ جانے اتنے خوش ذوق روسیوں کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے۔ ایک بالکنی پر شکستہ سائیکل رکھی ہے۔ بچے کی گاڑی رسی سے لٹک رہی ہے۔ منظر و فضا بیحد hum-au ہو گیا۔ ہر اجنبی شہر مانوس شہر ہے۔ ہر جگہ ایک سے انسان بستے ہیں خواہ وہ اٹلی ہو یا امریکہ یا برازیل یا شمالی روس۔

ایک ٹرک پر لدے "ینگ پانیر" بچے ہنستے کھلکھلاتے زن سے نکل گئے۔ دوسرا ٹرک۔ تیسرا ٹرک۔ سرخ ٹوپیاں سرخ رومال۔ خوانین چغتائیہ کی اولاد۔ لینن کا چہرہ مہرہ بھی تاتاری تھا۔

"منگولوں نے ہم پر تین سو سال حکومت کی۔" کوچ میں برابر کی سیٹ پر بیٹھا الوشا مجھے یاد دلاتا ہے (الوشا زہریبیف یورپین روسی ہے ماسکو کے اہم ادبی رسالے کا نائب مدیر اور جدید انگریزی ادب کا ایکسپرٹ)

الیانوسک۔ والگا کے کنارے چھوٹا سا شہر۔ چوبی مکانات۔ سایہ دار

سڑکیں۔ ہمارے ہوٹل سے کچھ فاصلے پر والگا بہہ رہا ہے۔ رات ہوئی۔ گھپ اندھیری رات۔ والگا کے کنارے بہت تیز ہوا چل رہی ہے۔ رومانیہ سے آئے ہوئے چند ادیب خواتین و حضرات کے ساتھ میں ساحل پر ٹہلتی ہوئی بہت دور چلی گئی۔ شاید تاریکی میں کہیں دور لہروں پر سے "والگا بوٹ مین کا گیت" سنائی دے جائے۔ صبح کو ہم لوگ لینن کے مکان میں جاتے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف چوبی بنگلے۔ لینن کے مکان کی چوبی دیوار کے باہر فٹ پاتھ پر درختوں کے زرد پھول گر رہے ہیں۔ زائرین اور اسکول کے بچوں کا ہجوم۔ احاطے میں اونچی اونچی گھاس ایک طرف کنواں۔ لکڑی کا ڈول۔ چرخی۔ رسّی۔ یہاں لینن کی ماں پانی بھرتی تھی باپ اسکول انسپکٹر تھا مگر ایک معمولی انسپکٹر اف اسکولز کا معیار زندگی نئے امپریل روس میں کتنا بلند ہو چکا تھا۔ ڈرائینگ روم میں پیانو۔ فوٹو گراف۔ وکٹورین فرنیچر۔ والدہ لینن کے کمرے میں وکٹورین سنگھار میز پر ان کی اُون اور سلائیاں اُسی طرح رکھی ہیں۔ وکٹورین تہذیب ہمہ گیر تھی۔ یہ سازو سامان، لیمپ، قلمدان، برتن، سائیڈ بورڈ صوفے، آرام کرسیاں۔ یہ روسی مکان نہیں تھا۔ ایک اجنبی تاتاری صوبے میں انیسویں صدی کا ایک مڈل کلاس روسی وہی چیزیں استعمال کر رہا تھا جو برطانوی ہند کے شہروں کی سول لائینز میں مستعمل تھیں۔ سنہ ۱۸۷۰ء کے زار شاہی روس میں والگا کے کنارے کے اس مکان اور سنہ ۱۸۷۰ء میں گنگا کنارے آباد کسی کوٹھی میں زیادہ فرق نہ تھا۔

دو منزلہ اسکول۔لینن کا ڈیسک جس پر نئے طالب علم کو پہلے روز بطور نیک شگون بٹھایا جاتا ہے!

اسکول سے کچھ فاصلہ پر نشیب میں والگا بہہ رہا تھا۔ سڑک پر دھول اڑ رہی تھی۔ ایک فوجی دستہ مارچ کرتا ہوا بولیوار پر سے گزر گیا۔ پتھر کے اطالوی جنگلے کے کنارے کنارے بولیوار پر الیانوسک کے شہری چہل قدمی کر رہے تھے۔ جنگلے کے نیچے سرسبز ڈھلوان پر دور دور تک چوبی کاٹج کھڑے تھے۔ ان کے بعد عظیم والگا جس پر اسٹیمر چل رہے تھے۔ اور لکڑیوں کے گھٹے لادے جہاز اور تجارتی بجرے۔ اور فولادی بیڑے۔ حد نظر تک والگا تھا۔

دوسری رات۔ پیلس آف کلچر کی جھاڑ فانوس اور قالینوں سے آراستہ عظیم الشان عمارت کے ہال میں تاتاری ادیبوں کا مجمع۔ اسٹیج پر بیٹھے ایک صاحب کا نام قاسموف ہے شکل سے ایرانی لگتے ہیں یا آذربائیجانی۔ یا اگر شیروانی پہنا دی جائے تو ایرانی نژاد لکھنوی۔ نام سید قاسم حسین رضوی بی اے علیگ ہو سکتا ہے کامریڈ قاسموف کے والد یا دادا کا نام سید کاظم حسین رضوی ہی رہا ہو۔ اور شیروانی پر یاد آیا کہ یہ لباس کیا شیروان (آذربائیجان) سے ہمارے ہاں پہنچا تھا؟ بہر حال یہ قاسموف صاحب شکلاً تاتاری نہیں یقیناً آذری ہوں گے۔ آذربائیجانی ہی نکلے۔

طویل تقریریں جاری ہیں کیمروں کی فلیش لائیٹ بار بار چمک رہی

ہے۔ میں اٹھ کر باہر آجاتی ہوں۔ پیلس آف کلچر کی شہ نشین کا رخ والگا کی جانب ہے۔ تاریک رات دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ دریا پر روشنیاں جھلملا رہی ہیں۔ والگا کے دوسرے سرے پر یہاں سے بہت فاصلے پر کازان ہے۔ جنوب میں اردوئے معلّا کا سرائے۔

... دو مرتبہ درمیانِ ایشان کارہاتِ عظیم در پیوست دتمو چن ظفر یافت۔ در در چہل ونہ سالگی وبقولے در پنجاہ سالگی در رمضان پانصد و نود و نہم بدولت سلطنت وجہانداری کامران شد و چوں مدت سہ سال از فرمانروائی وجہانبانی او گذشت بت تنگری[1] کہ از مبشران عالم غیب ومژدہ رسانان درگاہ کبریا بود بالہام ربانی تموچن را بخطاب چنگیز خان مخاطب ساخت یعنی شاہ شاہان۔ روز بروز نجم سعادتش فروزاں ترمی شد۔ وسال بہ سال برق دولتش سوزاں ترمیگشت بر تمام خطائے وختن وچین وماچین ودشت قپچاق وسیقتن وبلغار وروس وآلان وغیرہ آں سروری یافت او را چہار فرزند بود۔ جوجی۔ چغتائی۔ اوکدائی۔ تولی۔ ترتیب بزم وشکار تعلق بجوجی داشت ...

"ہلو۔ کیا ہو رہا ہے۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ ایک انگریزی داں داغستانی تاتار شاعرہ جنگلے سے ٹک کر سگریٹ سلگا رہی تھی۔ "موسم گرما کی راتیں۔" اس نے کہا۔ "والگا کے کنارے نہایت خوشگوار ہوتی ہیں۔ آپ کو خود مختار

[1] ترکی زبان میں خدا کا نام۔

جمہوریہ داغستان کی سیاحت ضرور کرنی چاہیئے۔ دا لگا پر جہاز کے ذریعے یہاں سے والگوگراڈ تک کا سفر"

والگوگراڈ یعنی چغتائیوں کا سرا ئے ۔

آدھی رات کا سورج

ہوٹل لینن گراڈ جنگ سے پہلے کی عمارت ہے، جمے ہوئے سنگریزوں
کی سڑک جس پر سے گزرتی ٹرامیں عورتیں چلا رہی ہیں۔ سرمئی دو منزلہ عمارتیں
کچھ کچھ پرانے لندن کی جھلک ۔ لینن گراڈ - پیٹرو گراڈ - سینٹ پیٹرز برگ۔
روسی کے بجائے مغربی شہر ہے جسے ۱۷۰۳ء میں پیٹر اعظم نے جرمنی اور
فرانس سے معمار بلوا کر تعمیر کروایا تھا۔ اسکا نام بھی خالص جرمنی رکھا۔ سینٹ
پیٹرز برگ جرمن ہی اس شہر پر ڈھائی سو سال بعد قیامت ڈھانے
والے تھے۔

خالص یوروپین شہر جو شمال کا وینس کہلاتا ہے اور دریائے نیوا کے
دہانے پر ایک سو جزیروں پر آباد ہے۔ ان گنت نہریں۔ چھ سو پل۔

رفیع الشان عمارتیں۔

طعام شب کے بعد اپنی فلور پر جا کر میں نے اپنے کمرے کے دریچوں کے سیاہ پردے برابر کیئے تاکہ قطب شمالی کے سورج کا اجالا معدوم ہو جائے۔

جب آنکھ کھلی اور اٹھ کر پردے کھینچے۔ باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پیٹر اعظم کے سمر پیلس پیٹر ہاف جانے کے لیے بندرگاہ روانہ ہوتے کا وقت صبح نو بجے کا تھا۔ فوراً تیار ہو کر باہر گئی۔ گیلری میں سناٹا۔ بہت دیر ہو گئی۔ سب لوگ بریکفاسٹ کے لیے نیچے جا چکے ہوں گے۔ نیچے ڈائننگ ہال سنسان۔ لے بھیا۔ لوگ باگ ناشتہ کر کے بندرگاہ چلے بھی گئے۔ باہر چوکیدار اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اشاروں میں پوچھا کیا لوگ جا چکے؟ اس نے نہایت مبہم انداز میں سر ہلایا۔

باہر نکل کر ٹیکسی ڈھونڈوں مگر ڈرائیور کو کیسے سمجھاؤں کہ بندرگاہ جانا ہے۔ سڑک پر سناٹا۔ عجیب ماجرا ہے۔ لوگ باگ سب کارخانوں اور دفتروں کو جا چکے ہیں۔ کم از کم صبح کا دس بجا ہوگا۔ آسمان سورج کی روشنی سے معمور۔ اچھا ٹیکسی کر کے پہلے رائیٹرز یونین جاؤں وہاں سے وہ لوگ بندرگاہ پہنچا دیں گے۔ مگر رائیٹرز یونین کا پتہ کیسے معلوم ہے۔ ٹیلی فون بوتھ سے فون کیا جائے۔ لیکن یہاں ٹیلی فون ڈائریکٹریاں ہی نہیں ہوتیں۔ کچھ سڑک پر ادھر ادھر گھوم کر ہوٹل واپس۔

ایک انفرمیشن ڈیسک پر ایک لڑکی بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی اس نے

سر اٹھا کر تعجب سے دیکھا۔ اسے انگریزی آتی تھی۔ میں نے واقعہ بتایا کہنے لگی ابھی تو صبح کے صرف تین بجے ہیں۔

Finnish Bay کی سمت جو لکژری اسٹیمر جارہا ہے اس میں اور مغربی یورپ کے کسی جہاز میں ذرا فرق نہیں الّا اسکے کہ ڈرائنگ روم میں مارکس اور لینن کے مجسمے سجے ہیں اور اسٹیمر کا نام شوچنکو ہے جو یوکرین کا قومی شاعر تھا۔ اور مسافر سنجیدگی سے شطرنج کھیلنے میں محو ہیں۔ سطح سمندر پر سے شہر کی اسکائی لائین اور گرجا کے منارے نظر آرہے ہیں۔ شمالی یوروپین فضائیں۔ کلا استوپی اور انکا ہنگرین ساتھی ڈاکٹر زولٹن دستکان۔ رومانیہ کی طرح ہنگری پر ترکی سابقہ تسلط کا لسانی اثر۔ جہاز کے ایک ریسٹوران میں دریچے کے پاس کیویار کھا رہے ہیں۔ باہر ایک دوکان پر ایک لبنانی عیسائی شاعر اپنے بچوں کے لیے کھلونے خرید رہا ہے۔ سامنے سے گزرتا ایک مصری اسے مخاطب کرتا ہے۔

"السلام علیکم۔"

"رحمتہ اللہ۔" وہ تپاک سے جواب دیتا ہے۔ کھلونے خرید کر ڈیک پر چلا آتا ہے جہاں جیہ کین اکتائی ہوئی کھڑی ہیں۔ "میں تو اپنے کیبن میں جاکر سوتی ہوں۔ جب ہیڑ ماف آئے مجھے جگا دینا۔" انھوں نے مجھ سے کہا۔

"آپ کو سمندر اچھا نہیں لگ رہا؟"

"اس میں کیا خاص بات ہے؟ بہت سارا پانی ہی تو ہے۔" وہ جمائی لیتی اپنے کیبن کی سمت روانہ ہو جاتی ہیں۔ لبنانی شاعر اب پلنگ پر جھکا

سمندر کو تک رہا ہے۔ وہ عرب اسرائیل سیاست کا تذکرہ چھیڑ دیتا ہے۔

"آپ عرب لوگ ـــــ" میں کہنا شروع کرتی ہوں۔

"میں عرب نہیں ہوں" وہ بُرا مان کر کہتا ہے۔ "میں فنیقی ہوں" پھر وہ عربوں کی شکایتیں شروع کرتا ہے۔

بہت ممکن ہے وہ بیروت کی خانہ جنگی میں ابتک مارا گیا ہو بے چارہ اپنے بچوں کے لیے کس شوق سے کھلونے خرید رہا تھا۔

سمندر پر سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک سرخ رنگ کی چھت والے مکان کی وضع کی کشتی سامنے سے گذرتی ہے۔

دور سے پیٹر ہاف نظر آنے لگا۔ ایک بلغاری شاعر جو شکل سے فلم ایکٹر لگتا ہے ریلنگ پر جھک کر شکستہ فرنچ میں کہتا ہے ـــــ "بالکل ورسائی کی قسم کا محل ہے ـــــ"

یہ واقعہ ہے کہ ان سب یوروپین اقوام کا تہذیبی ورثہ ایک ہے۔

پیٹر ہاف کی سنسان جیٹی پہ ایک موٹی روسی عورت پختہ عمر، سر پر رومال باندھے، پھرتی سے آگے بڑھی۔ کیا طاقتور خاتون تھی۔ یہ موٹا رسہ اٹھا کر اس نے جہاز کو کھونٹے سے باندھ دیا۔ گھاٹ کے دفتر میں ایک لڑکی اپنی ڈیوٹی پر چوکس بیٹھی تھی۔ سیلانی روسیوں سے بھری طیارہ نما جیٹ کشتیاں آآ کر جیٹی سے لگ رہی تھیں۔ یہ اتوار کا دن تھا۔

ایک طویل پل کے اختتام پر وہ مشہور عالم واٹر گارڈنز جن کے نادر برنجی

مجسمے جرمنوں نے تباہ کر دیے تھے۔ سب دوبارہ بنا لیے گئے۔ باغ کی سیڑھیاں چڑھ کر زار کا محل۔ ایک سمر پویلین کے نیچے بالٹک لہریں مار رہا ہے۔ اس چوبی بنگلے کی دیواریں بیش قیمت تصاویر سے مزین ہیں۔ ایک کمرے میں نادر چینی ظروف اور ایرانی مینا تور۔ ایرانی تصاویر روسی جنرل قاچاری ایران کے خلاف جنگوں میں ظفریاب ہونے کے بعد وہاں سے لا کر زاروں کو پیش کرتے ہوں گے اس طرح مغل نوادر انگلستان پہنچے۔

زار پیٹر کا یہ روسی ڈچ وضع کا محل بھی جرمن معماروں نے تعمیر کیا تھا اور جرمنوں ہی نے اسے ۱۹۴۱ء میں تاراج کیا۔ وسیع بادر چیخانے کے (جہاں پیٹر اعظم زیادہ وقت گزارتا تھا) دریچے بھی بالٹک پر کھلتے ہیں۔ محل کے باغات فوارے اور آبشار ورسائی کی طرز کے ہیں " آبی باغات" میں پیٹر نے JOKE FOUNTAINS لگوائے ان زمین دوز خفیہ فواروں پر زار کے مہمان پاؤں رکھتے اور پانی اچھل کر ان کو شرابور کر دیتا پیٹر بے حد محفوظ ہوتا۔ اسکا حسِ مزاح مشرقی سلاطین کا سا تھا۔ مغل بادشاہوں کی طرح وہ بھی پانی اور فواروں کا شائق تھا۔ چودہ میل دور تک پیٹر ہاف کے لیے پانی کے پائپ پھیلائے گئے تھے۔ یہ ڈھائی ہزار پائپ دس ہزار گیلن پانی فی سکنڈ چشموں سے لاتے تاکہ پیٹر کے واٹر گارڈنز کے فوارے مسلسل چلتے رہیں۔

اب دھوپ سڑک اور ساحل پر اتر آئی ہے پیٹر کے آبی باغ میں بچے اچھلتے کودتے پھر رہے ہیں۔ کہیں پاؤں رکھدو ایک خفیہ فوارے

کا پانی اچھل کر شہرا بور کر جاتا ہے۔ نفقا مسرور قہقہوں سے معمور ہے۔ ڈھلوان پر شاندار جنگل سمندری ہوائیں سائیں سائیں کر رہے ہیں۔ ساحل پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا ایک روسی مصوّر —— جو یوروپ کے کسی بھی ملک کا مصوّر ہو سکتا ہے —— فرینچ بیرے —— فرینچ کٹ داڑھی —— چوڑی سیاہ بوٹائی —— ایزل پر تصویر بنا رہا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر پاس سے گزرتے ہم لوگوں کو دیکھا تک نہیں۔

وہ سارا زمانہ سمندر میں واپس آ گیا۔

پیٹر یقیناً ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ کی طرح دارا حشم اور عیش پسند تھا۔ (اس قسم کی روسی اور ہندی مغل شان و شوکت کو صنعتی انقلاب سے قبل یورپین سیاح BARBARIC SPLENDOUR کہتے تھے۔) لیکن فرق یہ تھا کہ ہمارے بادشاہ اپنے حال میں مگن رہے اور نگ زیب کے ہم عصر پیٹر نے خود مغربی یوروپ جا کر جہاز سازی کے کارخانوں میں کام سیکھا اور مغربی ماہرین بلوا کر اپنے ملک کو ترقی کے راستے پر لگا گیا۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ روسی زار اپنے تاتاری آقاؤں سے ہمسری کا دعوےٰ نہ کر سکتے تھے اور ان سے ملنے سے کتراتے تھے۔ تاتاری سلاطین انکو اجڈ اور گنوار سمجھتے تھے۔ دربار میں نقالوں، مسخروں اور پہلوانوں کے تماشے اور جنگل روسی خواص وعوام کی تفریحات تھیں۔ شاہی جشن دیہاتی زمینداروں کی تقریبات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔

پیٹر اعظم نے ماسکو میں تھیئٹر تعمیر کروایا۔ بیلے کو ترقی دی۔ سوئیڈن سے

جنگ جیتا تو جنگی قیدیوں کو حکم دیا کہ درباریوں کو مغربی رقص سکھائیں۔ پیٹر اپنے تین عظیم حریفوں ۔ سویڈن، ترکی اور ایران کے خلاف جدال کرنے کے ساتھ ساتھ روس کو موڈرن بنانے کے درپے رہا۔ جب اس نے روسی عورتوں کو پردہ ترک کرنے اور مردوں کو داڑھیاں منڈانے کا حکم دیا ہے اس کے کچھ عرصے بعد باب عالی میں متعین برطانوی سفیر لارڈ بنجیٹ نے جولائی ۱۷۰۲ء میں اپنی ڈائری میں لکھا " روسی سفیر اور اس کے افسر سلطان ترکی کے دربار میں ایسا حلیہ بدل کر پہنچے ہیں کہ ترک اچنبے میں ہیں۔ سارے روسیوں نے فرانسیسی پوشاک پہن رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سونے چاندی بیں جھالروں سے مزین ہیں۔ ترک سب سے زیادہ متعجب اس بات پر ہیں۔ ان سارے تازہ وارد روسیوں کی داڑھیاں غائب یا منظر العجائب۔ مغرب میں عبادت کے وقت ٹوپی اتارنے کا دستور ہے۔ جبکہ مشرق میں سر ڈھانپ کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ روسی بھی اب تک سر ڈھانپ کر عبادت کرتے تھے۔ پیٹر اعظم کے نئے دربار کے یہ نئے روسی جو ترکی آئے ہیں انہوں نے ادیاپل کے گرجا میں ماس کے وقت مارے مغربیت کے جوش کے ٹوپیاں تو ٹوپیاں وگ تک اتار دیے "

اسی مغربیت زدگی کی وجہ سے روس کے طبقہ امرا کو عیش پرستی اور اچھے مکانوں اور اعلیٰ طرزِ آرائش کا شوق چرآیا ورنہ اس سے قبل عام مشرقیوں اور دیہاتی زمینداروں کی طرح یونہی اپنے گھاس پات پر رہتے تھے۔ اب چوبی مکانوں کے بجائے پتھر اور اینٹ کے محل دو محلے تعمیر

کیے گئے۔ پیٹر کے شہر میں روسی جگمگاہٹ، ڈچ روف لائن فرنچ لے
آؤٹ اور جرمن سجاوٹ نظر آتی ہے۔

لینن گراڈ کے چپے چپے سے پیٹر کی روح جھلکتی ہے۔ وہ روس کا
آج بھی ہیرو ہے اور اسے عوام دوست حکمراں سمجھا جاتا ہے۔ بڑا عجیب
و غریب شخص رہا ہوگا۔ بے تحاشا لمبا تھا۔ اس کا ماڈل خود اسی کی پوشاک
میں ملبوس ارمتاژ کے میوزیم میں موجود ہے سر پر اس کے اصل بال جو مرتے
وقت کاٹ دیئے گئے تھے۔ لگائے گئے ہیں۔ سرخ بال، نیلی سرد آنکھیں۔
پُر جلال شخصیت، دیو کا دیو۔ سات فٹا۔ ایک گلاس کیس میں کرسی پر بیٹھا ہے۔
یہ محل ونٹر پیلس اس کی بیٹی بنوا گئی۔ زار پیٹر کے بعد روس پر تین زارینہ حکمراں
رہیں۔ تینوں ایک سے ایک تیز فہم اور دانا۔ پیٹر کی لڑکی ایلزبتھ اوّل ۱۷۴۱ء
میں تخت نشین ہوئی۔ اس کے عہد میں جرمنی اور ہالینڈ کے بجائے فرانس
روسیوں کا تہذیبی آئیڈیل بنا۔ وہ بھی باپ کی طرح نفاست پسند اور
عیش پرست تھی۔ اس نے اور زیادہ بڑھیا عمارتیں بنوائیں اور کاخِ زمستاں
جو یوروپ کا سب سے بڑا محل ہے۔ ڈیڑھ ہزار کمرے ۱۹۴۵ دریچے
ایکسو سترہ زینے پھر اس نے دریائے نیوا کی منجمد سطح پر برف کی سلوں کا
ایک تھیٹر بنوایا۔ انھی کے عہد میں تھیٹر اور بیلے کا فروغ ہوا۔ اس کی بیٹی
کیتھرین دوئم (۱۷۶۲ء۔۱۷۹۶ء) کے عہد میں فرانسیسی ادب کا چرچا ہوا۔
جس نے روسی ذہن کی تربیت شروع کی۔ نئے سیاسی تصورات، والٹیر،
سیاسی آزادی، وغیرہ کی باتیں روسی مصنفین اور شعرا نے شروع کیں۔

ساتھ ہی اپنے روسی ماضی پر ناز کا احساس پیدا ہوا۔ کیتھرین دی گریٹ نے اسلامی حکومتوں کو زیر کیا اور نئے مقبوضات روسیوں کے ہاتھ لگے انہیں سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ کتب خانے قائم کیے گئے۔ امراء نے ذاتی لائبریریاں جمع کرنی شروع کیں۔ تعلیم اب تک مذہبی اسکالرشپ اور گرجاؤں خانقاہوں اور راہبوں تک محدود تھی۔ اب طرزِ جدید کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ یوروپین کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ رومن نیو کلاسیکی یا جارجین طرزِ تعمیر جو اس وقت یوروپ اور انگلستان میں رائج تھا۔ (اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر ہندوستان میں بھی پھیل رہا تھا) روس میں اسکا رواج ہوا۔ کیتھرین کبیر جو ایک نہایت دل پھینک اور عاشق مزاج خاتون تھی۔ یوروپین اور انگریز ماہرینِ فنِ تعمیر اور مصوروں، موسیقاروں وغیرہ سے رومان بھی لڑاتی رہی۔ اطالوی مصوروں کو روس مدعو کیا۔ اب تک بازنطینی مذہبی مصوری رائج تھی۔ ان اطالوی مصوروں نے مغربی طرزِ مصوری کو روس میں فروغ دیا۔

کیتھرین نے ۱۷۹۶ء میں وفات پائی۔ اسکا بیٹا پال ایک انتہائی ظالم و جابر زار ثابت ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں اسکی موت کے بعد اسکا بیٹا الگزنڈر اوّل تخت نشین ہوا۔ یہ خاصا روشن خیال تھا۔ اور اس نے SERFDOM کے خاتمے اور اصلاحات کے منصوبے بنائے مگر اس وقت تک نپولین روس پر چڑھائی کا پروگرام بنا رہا تھا۔ لہذا الگزنڈر اوّل ریفارم ملتوی کر کے ملک کی اسلحہ بندی پر جٹ گیا۔ روس اور فرانس کی جنگ ۱۸۱۲ء میں ہوئی نپولین پر روسیوں کی فتح ایک معجزہ

تھی۔ الگزنڈر کو خیال آیا کہ فتح محض مدد الٰہی ۔ کی وجہ سے ہوئی لہٰذا وہ کاروبار
سلطنت کاؤنٹ اراکشیف کو سونپ کر خود تصوف اور عبادت میں مصروف
ہو گیا۔ یہ کاؤنٹ بیحد ظالم نکلا اس کے مظالم کی وجہ سے ملک میں
اصلاحات کا مطالبہ شروع ہوا۔ چند فوجی افسروں اور دانشوروں نے
ملکر ایک انقلابی جماعت کی تشکیل کی ۔

۱۸۱۲ء میں فرانسیسی حملے نے ماسکو تاراج کر دیا تھا۔ الگزنڈر اوّل
نے شہر دوبارہ تعمیر کروایا۔ نیا طرزِ تعمیر "نیا روسی ایمپائر اسٹائل" کہلایا۔
اس میں ساسانی، اولین اسلامی ایرانی اور کلاسیکل یوروپین طرزِ تعمیر کی
ہلکی سی جھلک موجود تھی ۔ ۱۸۲۵ء میں سیاسی فسادات بپا ہوئے جبھی زار
الگزنڈر اوّل نے انتقال کیا۔ اس کے بیٹے اور جانشین زار نکولس اوّل نے
سیاسی تحریک کو نہایت بے رحمی سے کچلا۔ روسی شاعر الگزنڈر پشکن
اسی زمانے کا حریت پسند شاعر تھا۔ بہت سے انقلابی لیڈر قتل کیے
گئے باقی سائبیریا بھیج دیئے گئے ۔ یہ زیادہ تر طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے
اس وجہ سے زار نکولس اوّل نے ارسٹوکریسی کی طرف سے بدگمان ہو کر
نئی مڈل کلاس کو اپنا وفادار بنانا چاہا اور انہیں بہت سی مراعات دیں ۔
یہ نئی مڈل کلاس بہت جلد خود ایک عیش پسند متمول طبقے میں تبدیل ہوئی
چنانچہ اس میں مزید انقلابی لیڈر پیدا ہوئے ۔

زاروں نے اپنی مطلق العنانی میں مشرقی حکمرانوں کو مات کر رکھا تھا۔
(اس وجہ سے اہل مغرب کہتے تھے کہ ان کی یہ ستم کوشی ان کے نیم مشرقی خون

اور نیم ایشیائی تمدن کا ورثہ ہے۔ (شہسواری، ونگل، رقص و سرود، داٹمہ کارنیول سینٹ پیٹرزبرگ کی ارسٹوکریسی کے مشاغل تھے۔ زارینہ کیتھرین کبیر چوبیس ہزار درباری ساتھ لے کر سفر پر نکلتی تھی۔ ۱۷۶۱ء میں اس کے پاس فقط پندرہ ہزار لباس تھے۔ قصرِ سرما کے ارمتاژ (یعنی راہب خانہ) میں ذاتی نوادر جمع کرنے شروع کیے دو سو پچیس تصاویر خریدیں پھر خریدتی ہی چلی گئی۔ وغیرہ وغیرہ)۔ سینٹ پیٹرزبرگ انیسویں صدی میں شاعروں مصوروں اور موسیقاروں کا شہر تھا۔ ایک محلے میں نکڑ پر دوستووسکی کا مکان۔ وہ ہمیشہ نکڑ کے مکانوں میں رہنا پسند کرتا تھا۔ اور اس کے پچھواڑے وہ تنگ و تاریک محلہ جسکا انٹریر دوستووسکی کے ناولوں کا داخلی ماحول ہے۔ جرم و سزا سے متعلق جگہیں۔

پشکن کا گھر زارکے شاہی امراء کے ایک محلے میں نہر کے کنارے واقع ہے۔ سجا سجایا مکان، لائبریری۔ وہ صوفہ جس پر ڈویل لڑنے کے بعد زخمی ہو کر اس نے دم توڑا۔ بیوی کے پارلر میں اس کی میز پر درزی کے بل۔ پشکن کی بیوی بالکل DUMB تھی فضول خرچ، فیشن کی شوقین اور اسی کے عشق میں پشکن نے اپنی جان دی۔" کلارا آہستہ سے اس انداز سے کہتی ہے گویا کسی ہمعصر عورت کے متعلق شکایت کر رہی ہیں یعنی ذرا دیکھو تو سہی مادام پشکن کتنی کم عقل ہیں۔

دریا کے کنارے روسی مصنفین کا میوزیم۔

سارا لینن گراڈ ایک اوپن ایر میوزیم ہے اور موسیقاروں اور اداکاروں

کا شہر۔ ہم لوگ رات گئے تک "سپید راتوں" کی ان سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں۔ وہ پل جس پر دوستووسکی کے کردار ان "سپید راتوں" میں ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ آدھی رات کا سورج پانی پر جھلملا رہا ہے سہانی دودھیا روشنی سارے خوابیدہ شہر پر چھائی ہوئی ہے۔ نہروں کا پانی رات کی دھوپ میں چاندی کی طرح چمک رہا ہے۔

ایک روز ونٹر پیلس کی سمت جاتے ہوئے مجھے درختوں سے نکلتا ایک مسجد کا گنبد نظر آیا۔ از حد متاثر ہو کر میں نے کلارا سے کہا اب مجھے اس مسجد کی ٹوہ لگی ہے چل کر اسے دیکھنا چاہیئے۔ میں اور کلارا ایک ٹیکسی لے کر تاتاری مسجد روانہ ہوئے۔

ایک ہرے بھرے پارک کے سامنے سینٹ پیٹرز برگ کے شمالی مغربی ماحول میں اچانک ایک وسط ایشیائی بیضوی گنبد۔ ایرانی موزیک۔ آیات قرآنی سے منقش محراب۔ مسجد سنسان پڑی تھی۔

"سوال یہ ہے کہ یہ مسجد ونٹر پیلس کے اتنے نزدیک کیوں بنائی گئی؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"غالباً اس لیے کہ نماز کے بعد لوگ اگر کوئی خفیہ سیاسی میٹنگیں یہاں کریں تو زار کو فوراً اطلاع ہو جائے" کلارا نے کہا۔

احاطے کا پھاٹک مقفل تھا۔ ہم لوگ چکر لگا کر دوسری طرف پہنچے۔ دو ادھیڑ عمر کے آدمی مسجد کے جنگلے سے ٹکے کھڑے تھے۔ دونوں شکل سے بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے کلارا نے روسی میں ان سے بات شروع کی۔

وہ دونوں سگے بھائی داغستانی تھے۔ نماز عصر کے بعد گھر جانے والے تھے۔ ان میں سے ایک نے محاصرہ لینن گراڈ میں حصہ لیا تھا اور یہیں رہ کر ایک روسی عورت سے شادی کر لی تھی۔ دوسرا بھائی بھی لینن گراڈ میں ملازم تھا۔ اس نے موٹے شیشوں اور ٹوٹی کمانی کی عینک لگا رکھی تھی۔ شاید دونوں مزدور تھے۔ لینن گراڈ میں تیس ہزار مسلمان رہتا ہے۔

ان داغستانی بھائیوں کی مادری زبان آوآر تھی جو غالباً التائی ترکی لسانی خاندان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔

"مسجد تو بند ہے واپس چلیں" میں نے مایوسی سے کہا۔ اتنے میں احاطے میں سے ایک صاحب باہر آتے نظر آئے۔ انہوں پھاٹک کا تالہ اندر سے کھولا۔ اور مسکرائے نفس پتلون اور کوٹ میں ملبوس۔ سنہری داڑھی۔ ہاتھ میں بریف کیس۔ وضع قطع سے کسی دفتر کے اعلیٰ ایگزیکٹو معلوم ہو رہے تھے۔ پتہ چلا پیش امام ہیں۔ کلارا نے فوراً مدعا بیان کیا۔ خوشی سے کھل گئے۔ "بدر الدین تاتار۔ رئیس المسجد" عربی رسم الخط میں اپنا نام کارڈ پر لکھ کر مجھے دیا اور تپاک سے اندر لے گئے۔ احاطے کی دو منزلہ عمارات میں شمالی جمہوریہ تاتار کے مسلمانوں کے مرکزی دینی دفاتر۔ ایک طرف ایک بورڈ پر لکھا تھا۔ خاتون لار طہارہ خانہ سی ۔ عورتوں کا وضو کرنے کا کمرہ۔ سارے بورڈ ترکی زبان اور عربی رسم الخط میں تھے۔

مسجد کے اندر داخل ہو کر باتیں کرتے کرتے دفعتاً ملحد کلارا نے تقدس کے غیر شعوری احساس کے ساتھ اپنی آواز نیچی کر لی۔ سرگوشی میں بولتی

رہی۔ اور چندرے کے بکس میں چند کوپک ڈالے۔

داغستانی مزدور خوش قسمت تھا کہ محاصرہ لینن گراڈ سے زندہ بچ نکلا۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر پسکاریوف قبرستان کی پانچ ہزار اجتماعی قبروں میں لینن گراڈ کے وہ پانچ لاکھ مرد و زن دفن ہیں جو ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۴ء کے دوران جرمن محاصرے میں ہلاک ہوئے۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا پارک۔ اونچی دیواریں۔ سنگ سرخ کے پرشکوہ مجسمے۔ مکمل سکوت۔ درختوں میں مدھم موسیقی بج رہی ہے۔ گھاس کے چوکور قطعات کے نیچے پانچ پانچ ہزار شہداء کی ہڈیاں اکٹھی دفن ہیں۔ ہر قطعے پر تروتازہ گلدستے جانے کتنے ہزارہا خاندان اپنے چہیتوں کو یاد کرنے ان گمنام قبروں پر آتے ہوں گے۔ سامنے وسیع چبوترے پر "ابدی شعلہ" فروزاں ہے اور مزید گلدستے اور ریتھ۔

دیوار پر روسی میں مختلف عبارتیں کندہ ہیں۔ کلارا مجھے پڑھ کر سناتی ہے۔ "ان بہادر مردوں عورتوں اور بچوں نے نوسو دن محصور رہ کر ناکہ بندی قحط، اور کڑکڑاتے جاڑے اور شدید بمباری کو جھیلتے ہوئے اپنے شہر کا دفاع کیا۔

"تم میں سے کسی ایک کی زندگی بھلائی نہیں جائے گی۔ مادرِ وطن اور ہیروسٹی تمہارے سامنے سر جھکاتے ہیں۔"

کلارا پڑھتے پڑھتے رک گئی اور بولی "تمہیں معلوم ہے —— بدقسمتی سے محاصرے کے ان تین برسوں کا جاڑا پچھلے ڈیڑھ سو برس کا سرد ترین

موسم تھا۔ ناکہ بندی کیوجہ سے لوگوں نے کمروں میں چسپاں وال پیپرز اکھاڑ کر انکا گوند چاٹا۔ چمڑا چبایا۔ جیسے کتے۔ بلی ابال ابال کر کھائے اور ہزاروں نے بھوک اور فاقے سے جان دی۔ ۲۷ جنوری ۱۹۴۴ء کے روز محاصرہ ختم ہوا۔ اس وقت سرخ فوج برلن کی طرف مارچ کر رہی تھی ——" وہ چپ ہوگئی۔

ہم لوگ چبوترے پر ادھر اُدھر مبہوت اور ساکت کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد کلارا نے سنگلاخ دیوار پر کندہ ایک روسی عبادت پڑھ کر نیچی آواز میں مجھے سنائی۔ LET NO ONE FORGET
LET NOTHING BE FORGOTTEN

درختوں میں چیکوؔسکی کا ایک اداس نغمہ مدھم سروں میں بج رہا ہے۔

شہر کے ایک اوپیرا ہاؤس میں خوش پوش بشاش تماشائیوں کا ہجوم۔ صحن میں فوارے چل رہے ہیں۔ ایوننگ گاؤن پہنے اوپیرا گلاس ہاتھ میں سنبھالے فیشن ایبل خواتین برآمدوں میں ٹہل رہی ہیں۔ اس وقت اس مجمع کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے بہت سے اور ان کے ماں باپ اور رشتے دار محاصرہ کے ناقابل برداشت مصائب جھیل چکے ہیں۔ انسان کی RESILENCE اور ہمت تعجب خیز ہے۔

شہر کا لینن میوزیم اس محل میں ہے جو کیتھرین دوئم نے تعمیر کروایا تھا۔ اکتوبر انقلاب سے قبل اس میں رئیس زادیوں کا کالج تھا۔ ایک بالائی منزل

پر لینن کا کمرہ۔ پلنگ۔ منہ دھونے کی چلمچی۔ دیواروں پر انقلابی لیڈروں کی تصاویر۔

پچلی منزل کے ایک ہال میں زارِ شاہی روس کی امیر زادیاں رقص کرتی تھیں۔ ونٹر پیلیس پر قبضہ کرنے کے بعد انقلابیوں نے یہاں آکر اس ہال میں اپنی پہلی میٹنگ کی۔

نیچے صحن میں ایک بکتر بند موٹر چبوترے پر کھڑی ہے۔ سینٹ پیٹرزبرگ کے فن لینڈ ریلوے اسٹیشن پر اتر کر لینن اس موٹر پر سوار ہوئے تھے۔ موٹر کے قریب دیوار کے نیچے ایک بنچ پر دو نوعمر لڑکے بیٹھے ہیں۔ لمبے بال۔ انداز میں کاہلی اور بے نیازی۔

"یہ ہمارے ہاں کے ہپّی ہیں" لیوبا کہتی ہے "لیکن یہ چرس گانجہ نہیں پیتے۔ ہمارے یہاں دستیاب ہی نہیں ہوتا۔ بس اسی طرح بال بکھرائے گٹار بجاتے گھوما کرتے ہیں"

محل کے دریچوں کے عین نیچے سمندر جیسا دریائے نیوا بہہ رہا ہے۔ تیز رفتار کشتیاں چمکیلی سطح آب پر سے گزرتی جارہی ہیں۔

یہ حسین شہر پچھلی جنگ میں کس طرح برباد ہوا اور دوبارہ اس طرح تعمیر کیا گیا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا صرف چوبیس پچیس سال قبل اس پر اتنی بڑی قیامت گزر چکی ہے۔

کلارا نے مجھ سے کہا "میں نے لینن گراڈ کے لیے کسی کتاب میں پڑھا ہے۔

BE BEAUTIFUL, CITY OF PETER.
STAY AS UNSHAKABLE AS RUSSIA
AND LET NO VAIN WRATH
TROUBLE THE ETERNAL DREAM OF PETER

شطرنج کے کھلاڑی

جھاڑ فانوس سے سجے لینن گراڈ ریلوے اسٹیشن سے سرخ تیر تیز رفتار ٹرین ماسکو کی سمت چھٹی۔ اسٹیورڈ لڑکیاں کوریڈور میں رکھے سماواروں میں سے چائے نکال نکال کر مسافروں کو پیش کر رہی ہیں۔ تمام حضرات ٹرین کے شرابخانوں میں بیٹھے ووڈکا نوشی میں مشغول ہیں۔ بیشتر خواتین اپنے اپنے کمروں میں چلی گئی ہیں۔ امریکن پبلشر خاتون کوریڈور کے ایک دریچے سے لگی باہر دیکھ رہی ہے۔ خوشنما منظر دیہات سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں "میرے والدین" وہ آہستہ آہستہ کہتی ہے۔ "انقلاب سے پہلے اسی علاقے سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ میرے والد بہت بڑے زمیندار تھے شاید وہ انہی میں سے کسی گاؤں میں رہتے ہوں گے" وہ متحیر آنکھوں

سے سامنے دیکھ رہی ہے۔

طامس وولف نے امریکہ کی ایک ٹرین کے سفر کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ "اٹلا نٹا مونٹ سے نیویارک تک سات سو میل اور بیس گھنٹے کے سفر میں انسان ایک پوری زندگی گزار لیتا ہے۔ شہر غائب ہو جاتا ہے پھر پہاڑی راستے۔ درّے۔ خزاں کے پگھلے ہوئے تانبے کے رنگ۔ برف کے منظر۔ تنہا پہاڑ۔ پرشور ندیاں۔ کاٹیج۔ کسی سڑک پر سے گزرتی اکیلی عورت۔ لگتا ہے یہ سب ہمیشہ سے ہیں ہمیشہ کے دوست ہیں۔ زندگی کا تلخ معجزہ۔ رات کے عمیق اندھیرے میں کچھ لوگ کسی اجنبی گمنام اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں۔ ٹرین کسی اور پلیٹ فارم پر رکتی ہے۔ روشنی میں زرد چہرے۔ باتیں کرتے خدا حافظ کہتے لوگ۔ بیک وقت اجنبی اور مانوس۔ یہ لوگ سب معدوم ہو جائیں گے اور آ جائیں گے۔ عظیم امریکن ٹرینیں اس عظیم و وسیع سرزمین پر رات کے اندھیرے میں اس طرح چلتی رہیں گی۔ زمین ابدی ہے۔"

اسی ریلوے لائن پر سینٹ پیٹرز برگ اور ماسکو کے درمیان زار کی رائل ٹرین چلا کرتی تھی۔ وہ شکلیں۔ چہرے، آوازیں، لباس سب کے سب معدوم ہو گئے اور اس سے پہلے اسٹیج کوچ اور سلیج اور اس سے پہلے نمدے کے پہیے دار چغتائی خیمے۔ کیا وہ سب لوگ واقعی کبھی موجود تھے، یا سب افسانہ ہی افسانہ ہے۔ ہزاروں روشنیاں دیکھیں۔ ہزاروں موسم، ہزاروں سڑکیں، اور ایک تیز تیلی روشنی کی صراطِ مستقیم اور گیس لائٹ

اور پلش اور بانات اور چمڑے کی کرسیاں اور تمباکو کی جہک اور اورینیٹ ایکسپریس اور دیگوں کی۔

اور ایک مرتبہ ہم لوگ یو۔ پی میں کہیں سے کہیں جا تے تھے۔ برطانوی عہد کی چوڑی ٹرین۔صاف ستھرے کمپارٹمنٹ۔ اس ٹرین میں ایک کوریڈور بھی تھا۔ اور وہ اچانک ایک گھنے جنگل میں رک گئی تھی اور کزن رشید بھائی نے آکر بتایا تھا کہ انجن کے سامنے بھینسا آگیا ہے۔ اور رات کو ٹرین کہیں رکتی تھی تو اس کے عملے کے آدمی سیاہ یونیفارم پہنے سرخ لالٹین ہاتھ میں لیے اندھیری پٹریوں کو دیکھتے بھالتے بہت پر اسرار معلوم ہوتے تھے۔ اور عجیب بات ہے طامس وولف نے بھی ایک جگہ تقریباً یہی واقعہ بیان کیا ہے۔

سُرخ تیر نامی ٹرین رات کی سفید دودھیا روشنی میں ماسکو کی سمت بھاگ جاتی ہے۔

ماسکو میں "انوشا" کا دفتر ایک خاموش سڑک پر ایک چھوٹی سی عمارت میں ہے۔ گھریلو سا۔ جیسا کہ ایک معقول ادبی رسالے کا دفتر ہونا چاہیئے۔ مصیبت یہ ہے کہ معقول ادب کی بھی دنیا میں الگ الگ توضیحات ہیں۔ "برف پگھلنے" کے بعد سے مغرب کے "رجعت پسند" شعراء و ادباء کے تراجم بھی اب روس میں شروع ہو چکے ہیں۔ خود "انوشا" عصری مغربی ادب پر تنقیدی مضامین لکھتا ہے۔ یوو تیشنکو کے اس عہد میں تھوڑا سا "ادبی انحراف" بھی شروع ہو چکا ہے۔ پرانی سلاؤ قوم پرستی جو بین الاقوامی اشتمالیت کے لیے جگہ خالی کر چکی تھی۔ پھر واپس آرہی ہے۔ انیسویں صدی کے روسی

ذہن پرستوں کے دو کیمپ بن گئے تھے سلاو نیشنلسٹ "خالص روسی تہذیب" کے علمبردار تھے۔ اس کے برعکس "مغرب پرست" انٹلکچویل روسی ذہن کو یورپ کے قریب لانے کے خواہاں تھے۔ مشرق و مغرب کی یہ کشمکش آج بعد از اسٹالین سوویٹ یونین انٹلکچویلز کے سامنے پھر موجود ہے۔ یہ اُدیرنیشن کنٹر کیموزم اور نئی لبرلزم سے منسلک ہے۔

رائیٹرز یونین کلب میں لوگ باگ حسبِ معمول شطرنج کھیلنے میں مشغول ہیں۔ ایک سہ پہر ایک کرسی پر خالی بیٹھے بیٹھے میں نے سامنے رکھی بساط پر مہرے جمانے شروع کر دیئے۔ اس ملک کا غالباً یہ دستور ہے کہ کسی پبلک جگہ پر بچھی ہوئی بساط پر آپ مہرے جما دیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کسی بھی اجنبی کے ساتھ بلا تعارف شطرنج کھیلنے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ فی الفور ایک صاحب سامنے آکر بیٹھ گئے اور پیادہ چلے۔ ان استاد لوگوں کے ساتھ کھیل۔ ناچار اپنا مہرہ بڑھایا۔ وہ روسی ادیب بانہ ی میں مستغرق ہو چکے تھے۔ گول موٹے شیشوں کی عینک، مانوس سی شکل شاید یہی اناطولی کنزنیٹوف صاحب تھے۔ چالیں سوچتے ہوئے شاید یہ بھی غور و خوض کر رہے تھے کہ روس سے مغرب کس طرح فرار ہوں۔ (یہ ماہ جولائی کا واقعہ ہے۔ چند روز بعد ہی آپ بحیرہ اسود میں کود کر تیرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے، اگر یہ وہی تھے۔

کھیل میرے لیے خاصا بُرا جا رہا تھا۔ الوشا ٹہلتا ہوا آیا۔ کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ بولا "تم بہت بُری طرح گھر گئی ہو۔ دھیان سے کھیلو ——"

حریف شاطر نے ایک اور مہرہ پٹیا۔ میں اپنے بچاؤ کی فکر میں لگی کہ اتنے میں کرسی کے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند۔ گویا روح کارل مارکس نے ایک فرشتہ رحمت بھیجا جو مجھے یہ بازی جاری رکھنے سے بچائے۔ میں نے حریف سے معذرت چاہی۔ انہوں نے متانت سے سر ہلایا۔ گویا کہتے ہوں جاؤ معاف کیا۔ بہرحال۔ یہ میری سوویٹ یونین میں آخری بازی ہے۔ میرے کرسی سے اٹھتے ہی ایک اور صاحب میری جگہ آن بیٹھے اور کھیل جاری رکھا۔

ملک اپنی جماعت کے ساتھ قاہرہ سے آئے ہوئے تھے۔ چند مصری اور افریقی اور عراقی رائیٹر لوگ کے ساتھ ہوٹل یوکرین میں مقیم تھے کہنے لگے میں چار دن سے ماسکو میں ہوں اور تم کو تلاش کر رہا ہوں۔

"میں ذرا لینن گراڈ گئی تھی ایک ہفتے کے لیے" میں نے اس بے نیازی سے کہا گویا ماسکو سے لینن گراڈ آئے دن جاتی رہتی ہوں۔ ملک نے حسبِ عادت کوئی لمبا قصہ چھیڑ دیا۔ پھر کہا "چلو کل صبح ٹالسٹائی کی کنٹری اسٹیٹ چلتے ہیں۔ میں پچیسوں بار روس آچکا ہوں پہلی بار شاید ۲۶ء میں آیا تھا۔ مگر آج تک یاسنایا پولیانہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

ایک صُوفی کا مزار

ملک مع اپنے مریدوں کے ہوٹل یوکرین میں ٹھہرے ہیں جو بھائی اسٹالین نے امریکی اسکائی اسکریپر طرز کا بنوایا تھا۔ اتوار کے روز صبح منہ اندھیرے کوچ ہوٹل سے روانہ ہوتی ہے۔ تقریباً خالی۔ صرف ملک اور الوشکا اور چودہ پندرہ مصری لبنانی افریقی ادیب۔ شہر سے باہر خوبصورت جنگلوں میں پکنک منانے والوں کی ٹولیاں جمع ہو رہی ہیں۔ شاہراہ کے کنارے بچے خودرو پھول اکٹھے کرنے میں مشغول ہیں۔ دریاؤں پر کشتی رانی کے مقابلے کیئے جا رہے ہیں۔ درختوں کے نیچے موٹریں کھڑی ہیں۔

اسی میل کا فاصلہ طے کر کے کوچ کاؤنٹ لیوٹالسٹائی کی خاندانی ریاست کی حدود میں داخل ہوئی۔ سیاحوں کا جمّ غفیر آئس کریم کھانے میں مصروف۔ جھیل میں بطخیں تیر رہی ہیں۔ زمینداری کے کچے راستے۔ اصطبل۔ درختوں کے نیچے بچوں

کو ٹالسٹائی کے متعلق لیکچر دیئے جا رہے ہیں کینٹری ہاؤس کے باہر مزید سیاح۔
گریک اور تھوڈوکس پادریوں کی ایک ٹولی جو سائپرس سے آئی ہے۔ بہت
سے مقامی پادری چند افریقی۔ دو عدد لاما۔

ٹالسٹائی کے کنٹری ہاؤس میں کمرے ان کے ذاتی سامان سے آراستہ ہیں۔
لائبریری میں اس استاد بزرگ کی اپنی کتابیں برآمدے میں رولنگ چیئر۔

سارا دن ہم لوگوں نے ٹالسٹائی کی زمینداری پر گزار دیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔
اونچے تناور درختوں کے جنگل میں سے گزرتے ہوئے ایک طویل کچا راستہ طے
کر کے ایک خاموش خوبصورت کنج میں پہنچے۔ جہاں دفعتاً ٹالسٹائی کی کچی قبر
نظر آئی۔ قبر پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس پر بڑے بڑے سفید اور زرد
گلابوں کے گچھے دھرے تھے۔ ایک صوفی کا مزار۔ سورج کی کرنیں بلند و بالا درختوں
میں سے چھن چھن کر منظر کو شفق رنگ کر رہی تھیں۔ شام کا بسیرا لینے والے پرندوں
نے اچانک زور زور سے چہچہانا شروع کر دیا۔ وہ نظارہ اس قدر پرفسوں تھا کہ
تقریباً غیر حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔

یاسنایا پولیانہ سے انسان کو بہت عجز اور احساسِ پاکیزگی اور مسرت اور
اداسی کے ساتھ واپس آنا چاہیئے۔

اور دن کے وقت ٹالسٹائی کے روس کی آخری جھلک۔ ماسکو سے باہر ایک
عظیم الشان فنکشننگ چرچ۔ چاروں طرف صنوبر کا جنگل۔ اندر ایک بوڑھی عورت
سیڑھی پر چڑھی ایک آئیکن کو بڑی محبت کے ساتھ جھاڑن سے صاف کر رہی
ہے اور زیرِ لب ایک گریگورین حمد گنگناتی جاتی ہے۔ سنسان، وسیع ہال

شمعوں اور طلائی اور مرصع دینی تصاویر سے جھلملا رہا ہے چند نوجوان عورتیں ایک تابوت اٹھائے اندر آئی ہیں۔ تابوت کا ڈھکنا کھلا ہوا ہے۔ جس کے اندر سفید اطلسی گدے پر ایک بوڑھی عورت ابدی نیند سو رہی ہے۔ چوبی تابوت مخصوص روسی گلکاری سے مزین ہے۔ وہ ضعیفہ اتنی نازک اور ہوائی سی ہے کہ بالکل ڈریسڈن چائینا کی مورتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بوڑھی عورت ٹالسٹائی کے روس میں ایک نوجوان حسین لڑکی رہی گی۔

پسماندگان تابوت کو اونچے شمعدان کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ چند منٹ بعد ایک اور جنازہ اندر لایا جاتا ہے اسے بھی عورتوں نے اٹھا رکھا ہے۔ اس کے اندر بھی ایک ضعیفہ لیٹی ہے۔ یہ کم از کم سو برس کی ہو کر مری ہے۔ اور شاید شدید جسمانی تکلیف سہہ کر مری ہے۔ کیونکہ بے چاری کے جھریوں سے بھرے چہرے پر کربِ موت کے گہرے نقوش منجمد ہو گئے ہیں۔ اسکا ایک ادھیڑ عمر کا رشتے دار ـــ غالباً بیٹا ـــ ٹوپی ہاتھ میں سنبھالے خاموش کھڑا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ لیو با سے کہتا ہے کہ مجھ سے کہدے کہ انسان ہر طرح کی مصیبتوں پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ دکھ اٹھاتا ہے کامیابی کا مزا چکھتا ہے۔ محبت اور نفرت کرتا ہے اور آخر انجام یہی ہے کہ بس مرجاتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے مصوّر کارڈوں پر چھپی دعائیں یا شاید مقدّس تثلیث کے نام عفو و بخشش کی درخواستیں۔ دونوں مرحومین کے تابوت میں رکھی جا رہی ہیں۔ ابھی پادری نہیں آیا ہے۔ عورتیں ساری رسوم ادا کر رہی ہیں۔

سو سالہ متوفیہ کا عزیز جس نے مجھ سے بات کی تھی، بے انتہا غمزدہ نظر

آرہا ہے۔ یقیناً مرحومہ کا بیٹا ہے۔ یہ شخص بھی لینن گراڈ کی مسجد والے دیندار داغستانی بھائیوں کے مانند مزدور یا کاشتکار ہے۔

صدر دروازے کے باہر کاؤنٹر پر بیٹھی ایک معمر عورت مذہبی تصاویر اور موم بتیاں فروخت کر رہی ہے۔ میں ایک روبل میں اس سے

OUR LADY OF VLADIMIR کے دو پرنٹ خرید لیتی ہوں۔

ایک اتوار کی شام۔ ایک مشہور قدیم خانقاہ کے گرجا میں عورتوں کا کوائر گریگورین CHANTS الاپ رہا ہے۔ گریک اور تھوڈوکس کلیسا کی مخصوص منفرد سحر آگیں گریگورین موسیقی۔ خانقاہ کے باغ میں (یہ ایک رسمفنی کا نام ہو سکتا ہے) ایک سیاہ پوش نوجوان پادری ایلم کے درختوں کے نیچے سے ٹہلتا ہوا گزر جاتا ہے۔ (نوجوان نسل میں سے اکادکا دیندار یا قاعدہ پادری بھی بن جاتے ہیں۔ تعجب!) اسٹرودسس کے ایک کنج میں چار پانچ مصور اپنے اپنے ایزل سامنے رکھے دنیا و ما فیہا سے بیخبر تصویریں بنانے میں محو ہیں۔ دفعتاً ہوا میں سردی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ سرد ہوائیں خانقاہ کی سنگلاخ بھوری دیواروں اور تاریک برجیوں اور تاریک خاموشیوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ اندر پکچر گیلری میں یونیورسٹی کے نوجوان لڑکے لڑکیاں قدیم بازنطینی تصاویر کو دیکھتے پھر رہے ہیں۔

پورنماشی کے چاند کی روشنی میں ساری خانقاہ گویا واگنر کی ایک گمبھیر تخلیق میں ڈھل گئی کچھ فاصلے پر سوویٹ یونین کے جگمگاتے دارالسلطنت کے ایک الٹرا موڈرن ہوٹل میں امریکن خلاباز فرینک بورمین کو روسی خلاباز ڈنر کھلا رہے ہیں۔

آرمینیہ کا چاند

شہر ماسکو کے باہر مختلف جمہوریتوں کو جانے والے فضائی راستوں کے لیے
الگ الگ ایرپورٹ ہیں آرمینیہ والے ایرپورٹ پر پہنچتے ہی ایسا معلوم ہوا
جیسے کوہ قاف یہیں سے شروع ہو گیا۔ تین چار طویل القامت نوجوان اور
بے انتہا خوبصورت سیاہ پوش ارمنی پادری نہایت وقار سے چلتے ہوئے
لاؤنج میں داخل ہوئے۔ چند ارمنی مسافروں نے فوراً بڑی عقیدت کے ساتھ
ان کے ہاتھ چومے۔ دو انجنوں والا طیارہ ارمنی پائلیٹ اڑا رہے ہیں۔ سیاہ
چشم ارمنی ایرہوسٹوں نے طویل بندے پہن رکھے ہیں اور ارمنی زبان میں
اناؤنسمنٹ کر رہی ہیں۔

آسمان بھی مختلف ہے۔ یوروپین روس کے خنک، شفاف سپید اور

یہ نیلے آسمان کا رنگ بدلنے لگا۔ تیز نیلا۔ گرم۔ لاجوردی۔ گہرا قرمزی۔ مخملیں۔ سیاہ ایشیا پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ کالے اطلسی آسمان پر کلا بتونی چاند جگمگانے لگا۔ مشرقی۔ تیز زرد۔ گرم۔ یورپ کے سرد۔ پیلے چاند سے مختلف۔

یروان ایرپورٹ پر آرمینین رائٹرز یونین کے دو دبلے پتلے لمبے نوجوان ادیب موجود ہیں جنہوں نے دو دن سے شیو نہیں کیا۔ ہم یقیناً مشرق واپس آ گئے ہیں۔

شہر کی سمت جانے والی سڑک کے دو رویہ ٹروپیکل درخت ہوا میں سوندھی مٹی کی مہک فضا میں کچھ اضمحلال سا آ گیا۔ مغرب کی ہوا ہی انسان کو چاق چوبند بناتی ہے۔

ہوٹل آرمینیہ کناٹ پلیس کی وضع کے ایک دائرے میں واقع ہے۔ عمارتوں کا اسٹائیل رومن ارمنی۔ واضح ہو کہ عہدِ عتیق کے آرمینیہ یعنی ارارتو کے فنِ تعمیر نے ساختمان ہائے ایرانِ قدیم کو متاثر کیا تھا۔

ہوٹل میں ہر طرف ارمنی۔ کسی نے دو دن سے شیو نہیں کیا تھا۔ عورتیں کچھ پارسیتن سی معلوم ہو رہی ہیں۔ تو واضح ہو کہ قدیم آرمینیہ اور قدیم ایران میں کافی نسلی گھپلا ہوا تھا۔ افق پر برفپوش کوہ ارارات دھوپ میں جگمگا رہا ہے اسی کے سائے میں ولادت مسیح سے آٹھ سو برس قبل اہل آرمینیہ نے اشوریہ اور بابل کے تسلط سے آزادی حاصل کی تھی۔ پھر ہخامنشی ایران نے ان کو اپنا غلام بنایا۔ پھر آزاد ہوئے۔ ۳۰۳ء میں قبولِ عیسائیت۔ ساسانیوں سے جنگ۔ پانچویں صدی عیسوی میں ارمنی سینٹ میزروب نے حروف

بنی ابجاد کیے جو یونانی اور سریانی رسم الخط سے متاثر تھے۔ اور آج تک وہی مستعمل ہیں۔ سینٹ میزروب نے ایک دارالترجمہ قائم کیا۔ اور ارمنی ادب پر یونانی لٹریچر کی گہری چھاپ پڑی۔ ارمنی بہت پڑھی لکھی قوم ہے۔

آرمینیہ کا ایک بادشاہ تگر بڑا جاہ و جلال والا تھا۔ ہم عصر ساسانی ایران نے اس کے بعد کے بادشاہوں کو تگر کا بیٹا۔ عربوں نے اسے تغفور کر دیا۔ یہ میرا خیال ہے ـــــ میں ہمیشہ سوچا کرتی تھی کہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمان شاہانِ چین کو فغفور کیوں کہتے تھے۔ تو یہ عقدہ ذرا غور و فکر کے بعد یوں کھلا ـــــ چین کے فرمانروا اپنے آپ کو SON OF HEAVEN کہلواتے تھے۔ قدیم فارسی میں جنت کو فردوس یا باغ کہا جاتا تھا چنانچہ ساسانیوں نے چین کے ہمعصر بادشاہوں کو باغ پور کے لقب سے یاد کیا یعنی فرزندِ جنت۔ ایران پر مسلم عرب تسلط کے بعد یہ باغ پور عربی میں فغفور ہو گیا۔ تغفورِ آرمینیہ۔ فغفورِ چین۔

گیارہویں صدی عیسوی میں آلِ سلجوق آرمینیہ کے تغفوروں پر حاوی ہوئے۔ اس کے بعد آلِ عثمان۔

ترکوں کے خلاف ارمنی جدوجہد آزادی اٹھارہویں صدی میں شروع ہوئی۔ سلطنتِ عثمانیہ کی بیشتر تجارت آرمینیوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اسی زمانے میں سینکڑوں ارمنی تاجر مدراس، کلکتہ اور ڈھاکہ میں آباد ہو گئے، مدراس میں اپنا ارمنی پریس قائم کیا۔ کلکتہ کی مشہور ہفت زبان مغنیہ گوہر جان ایک ارمنی یہودن تھی۔

ہم مذہبی کے ناتے ارمنی برابر مسیحی یوروپ کی طرف دیکھتے تھے۔ زار شاہی روس، فرانس اور برطانیہ ترکوں کے خلاف در پردہ ان کو امداد کرنے میں مصروف تھے

۱۸۰۱ء میں ارمنی راہب پیٹر میکتار نے قسطنطنیہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں اپنے وطن سے آکر ارمنی مغربی علوم پڑھتے تھے مگر خود حاکم قوم ترک ان علوم سے بے نیاز رہی۔

ترکی نظام ---- عجیب بات ہے۔ اسی دور کے متعلق پروفیسر آرنلڈ ٹوئینبی اپنی دس جلدوں والی تاریخ میں لکھتا ہے کہ عثمانی حکومت اپنی اقلیتوں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کرتی تھی۔ استانبول کے پل کی سیر کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر ۱۹۰۶ء میں لکھتے ہیں "سامنے سے ایک ارمنی پادری آ رہا ہے۔ سیاہ چوغہ۔ کھلی آستینیں۔ سیاہ اونچی ٹوپی۔ بہت بڑی داڑھی اور بال لمبے۔ جنہیں وہ چوٹی کی طرح لپیٹ کر پیچھے لٹکائے ہوئے ہے۔ یہ نئی چیز دیکھنے میں آئی ۔ یہی وہ عالی جناب ہیں جو اکثر چپکے چپکے بکھیڑے کھڑے کر دیا کرتے ہیں۔ اس وقت تو بہت بھولے بھالے غریب سے نظر آ رہے ہیں۔ اور نہایت امن پسندی سے جا رہے ہیں مگر ہیں طرفہ معجون مرکب۔ عادات میں مشرقی۔ تعصب میں مغربی۔ آزادی کی اہلیت کم۔ شوق زیادہ [1]"

دلچسپ نکتہ اسمیں یہ بھی ہے کہ جس طرح انگریز کہتے تھے کہ اہل ہند میں آزادی کی اہلیت کم۔ شوق زیادہ ہے۔ بالکل اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کے

[1] مخزن لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء

ایک مداح، بہی خواہ اور ہم مذہب ہندی مسلمان شیخ عبدالقادر ارمینیوں کے لیے یہی الفاظ استعمال کر رہے تھے!

سوویت آرمینیہ کی سرحد کے ادھر پہلوی کی سلطنت ایران واقع ہے. وہاں شہر اصفہاں سے کچھ فاصلے پر جلفا ایک ارمنی بستی ہے اسں میں عہد شاہ عباس صفوی کا ایک عالی شان ارمنی گرجا موجود ہے. دو سال قبل میں نے یہ گرجا دیکھا تھا۔ ہماری ٹولی میں زیادہ تر مغربی جرنلسٹ شامل تھے اور ایک ترک صحافی لڑکا اور لڑکی. ہم لوگ گرجا کے اندر چلے گئے. ترک لڑکا اور لڑکی باہر سڑک پر کوچ میں بیٹھے رہے میں نے بعد میں ان سے پوچھا وہ نوجوان ترک کہنے لگے ——" ارمینیوں نے ہمارے دشمنوں سے مل کر ہمارے ساتھ غداری کی۔ جبکہ سلطنتِ عثمانیہ کی بیشتر دولت اور تجارت انہی کے ہاتھ میں تھی۔"

"لیکن وہ قتل عام جو تم لوگوں نے کیئے۔ ارمینیوں کے ——"

لڑکا ہنس پڑا —— "زیادہ تر یوروپین اور برطانوی پروپاگنڈہ تھا۔ وہ ہمیں یوروپ کا "مردِ بیمار" کہتے تھے اور ہمیں ختم کرنے کے درپے تھے۔ اور اس میں کامیاب ہو گئے۔"

"لیکن ایک امپریل آقا کے خلاف ایک محکوم قوم کی جدوجہد آزادی بالکل جائز ہے ——" میں نے کہا "آخر عرب بھی تو تمہارے خلاف ہو گئے تھے جو تمہارے ہم مذہب تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ ہمیشہ ایک ملٹری سوسائٹی رہی۔ اگر اسں نے زمانے کے ساتھ ساتھ نظریاتی ترقی کی ہوتی تو تمہارے

ہاں نوجوان ترک تحریک ہی پیدا نہ ہوتی۔"

۱۹۶۷ء کے دونوں نوجوان ترک چُپ چاپ باہر دیکھتے رہے۔ وہ جذباتی طور پر بہت مضطرب نظر آتے تھے۔

اور پہلوی سلطنتِ ایران کی سرحد کے اِدھر سوویٹ آرمینیہ کے شہر یروان میں ایک فلک بوس مخروطی سنگلاخ مینار کے نیچے "ابدی شعلہ" فروزاں ہے۔

"ترکوں نے جو قتلِ عام کیا تھا اس میں مارے جانے والے اسّی ہزار ارمینی شہداء کی یادگار" ایک ارمنی ادیب نے مجھ سے کہا۔

میں نے خود کو چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھتے پایا۔ پھر میں نے اپنے اس ردِ عمل کا تجزیہ کیا۔ ترکوں سے ہم مذہبی اور ہمدردی وغیرہ کے ناتے میں اس ارمنی کی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ وہ قتلِ عام کی تفصیل بتا رہا ——— "۱۸۹۵ء ——— ۱۹۱۵ء۔ پھر روس نے ہمیں آزادی دلائی۔"

"زار شاہی روس نے" میں نے جواب دیا "آپ عثمانی شہنشاہیت سے نکل زار شاہی شہنشاہیت میں شامل ہو گئے ——— استانبول کے بجائے سینٹ پیٹرز برگ کیونکہ روسی آپ کے ہم مذہب تھے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ ہم پہاڑی سے اترنے لگے۔

ہر ملک اور قوم کے تاریخی تجربات اس کے اپنے تجربات ہیں۔ دوسرے انکو نہیں سمجھ سکتے۔ غالباً ترک اور ارمنی، ترک اور یونانی، ترک اور روسی ترک اور عرب اپنی اپنی جگہ سب کے قومی تجربات VALID ہیں۔

ایک اور میوزیم میں ترک طرزِ معاشرت کی یادگاریں۔ جس قوم نے آپ

کے اوپر آٹھ سو برس حکومت کی ہو۔ اس کی کلچر کا گہرا اثر ناگزیر ہے —— معزز ارمنی خواجہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے مثلاً ایک بڑی تصویر میں خواجہ پطرس رشید یان ترکی قبا پہنے گاؤ تکیے جھکے مسند پر بیٹھے ہیں۔

ولیم سارویان نے اپنے کزن مراد گارہ غلیان کے نام کی یوں تشریح کی ہے —— " یہ ارمنی نام دو ترکی لفظوں کا مرکب ہے۔ گار۔ سیاہ اور اوغلان —— فرزند —— "

اسکرپٹوریم کی سات منزلہ مدور جہازی عمارت میں ارمنی کے دس ہزار مخطوطات، مصور نسخے اور عربی فارسی کتب۔ ۱۴۵۱ء کے لکھے ہوئے ایک مصور صحیفے میں ہاتھیوں پر سوار ساسانی لشکر آرمینیہ پر حملہ کر رہا ہے۔

اس متاع نادر آں کی ہر منزل ارمنی خانقا ہوں کے ایوانوں کی طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔

قومی پکچر گیلری —— قلعہ یروان کا محاصرہ —— ۱۸۲۷ء۔ جب یہ روسی لشکر نے ارمنی تعاون کے ساتھ ایرانیوں سے چھینا۔

جنگ روس و ترکی ۱۸۷۸ء۔ جس میں ارمنی سپاہی ترکوں کے خلاف لڑے۔ ترکی پرچم زمین پر پڑا ہے۔ روسی اور ارمنی چاروں طرف خوش کھڑے ہیں۔ اس جنگ کے صلحنامے کی رو سے صرف مغربی آرمینیہ ترکی کے پاس باقی بچا۔ باقی ملک روس میں شامل ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم میں آرمینیہ روس کی حمایت سے ترکی کے خلاف لڑا۔ جب ۱۹۱۹ء میں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کیے گئے۔ امریکہ نے تجویز کی کہ آرمینیہ امریکن تحفظ میں ایک خود مختار ریاست

بنا دی جائے۔ اتاترک ؒ نے یہ منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ ۱۹۲۰ء میں
آرمینیہ سوویت یونین میں شامل ہو گیا۔

ایک قدیم گرجا گھر کے پھاٹک پر بوڑھا چوکیدار کرسی پر خاموش بیٹھا
ہے۔ اندر پورٹیکو میں اس کی گدڑی رکھی ہے (روس میں فنکشننگ گرجا اور
مساجد دیندار لوگوں کے چندے سے قائم ہیں)۔ تہ خانے میں ایک نوجوان
ولیہ کے مزار پر شمعیں روشن ہیں۔ باہر باغ میں درخت پھلوں سے
لدے کھڑے ہیں، چوکیدار کے لڑکے نے چند پھل توڑ کر مجھے پیش کیے۔
یہ گرمیوں کا موسم ہے۔ بوڑھا اور اُسکا لڑکا پورٹیکو کے فرش پر گدڑی بچھا
کر سوتے ہیں۔ پھاٹک کے باہر گلبار درختوں کے نیچے چند بچے ننگے پاؤں خاموش
سڑک پر کھیل رہے ہیں۔

ایک الیکٹرونکس فیکٹری میں مزدور عورتوں کا بیوٹی پارلر —— سفید کوٹ
پہنے نوجوان مشاطائیں مزدور لڑکیوں کا سنگھار پٹار کرنے میں مصروف ہیں۔

بیس لاکھ ارمنی دوسرے ملکوں میں جا بسا ہے۔ تھوڑے سے واپس
آ چکے ہیں۔ ہوٹل میں ایک ارمنی امریکن جوڑا مقیم ہے۔ وہ بھی ولیم سیرویان کی
کے سان فرانسسکو سے۔ کنٹری کی زیارت کے لیے آیا ہے۔

جب وہ دونوں باہر نکلتے ہیں۔ نیٹو ارمنی ان کو گھیر لیتے ہیں۔

ارمنی ایک ذہین، طباع اور آرٹسٹک قوم ہیں شاید اس وجہ سے
شیو نہیں کرتے۔

کیا کشتی نوح واقعی موجود ہے؟ ان گناہ گار آنکھوں نے اسے دیکھا۔

آرمینیہ کے اسقفِ اعظم کے محل کی ایک الماری میں سونے کے فریم میں جڑا لکڑی کا ننھا سا ٹکڑا۔

دریچے کے باہر کوہ ارارات جگمگا رہا تھا ——— کلیساؤں کے باغات میں شاندار خوش شکل کم عمر پادری باوقار انداز سے روشوں پر سے گزر رہے ہیں۔

۔۔یروان ایرپورٹ کے باغ میں ایک بنچ پر ایک ارمنی جوڑا بیٹھا اپنے طیارے کا انتظار کر رہا تھا وہ بھی انگریزی داں نکلے۔ (سوویت یونین میں غیر زبانیں جاننے والوں کی تعداد حیرت انگیز ہے)۔ سامنے کچھ فاصلے پر تیز روشن نیلے آسمان کے سرزمین ترکیہ پر کوہ ارارات چمک رہا ہے۔ میں نے خوشی سے کہا ——— "ترکی یہاں سے کتنا قریب ہے۔ یہیں سے نظر آ رہا ہے"

ارمنی جوڑے نے فوراً ناگواری سے مجھے دیکھا۔ پھر مرد بولا "یہ آرمینیہ کا پہاڑ ہے۔ ترکی نے اسے ہم سے چھین لیا"

شاید ارمنی اور ترک کبھی ایک دوسرے کو معاف نہ کریں گے۔

آرمینیہ سے واپس آنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے ولیم سیرویان کے انکل خسرو۔ انکل ملک، کزن ارام ——— کیلی فورنیا کے تاکستانوں میں کام کرنے والے مہاجر ارمنی اتنے اداس اور جذباتی اور فلسفی قسم کے کردار کیوں ہیں۔

گلِ سرخ بر طاقِ نیلوفری

کیسپین یا خزر جسے اہل ایران دریائے مازندران کہتے ہیں۔ تیز نیلی سطح آب۔ اچانک آذربائیجان۔ زرد زمین۔ حدِ نظر تک تیل کے چشموں کے میناروں کا جنگل۔ چٹیل میدان اور ہزاروں ہزار تیل کا کنواں۔ ایرپورٹ کی دوکانوں میں مرصع چھوٹے چھوٹے خنجر، مرصع پستول۔ رنگین رومالوں پر شہسواروں کی تصویریں ہم بانکے آذری ترک سورماؤں کی سرزمین پر موجود ہیں۔ یہودی نژاد سادہ لوح لیوبا کے بجائے ایک نوجوان بیحد ذہین اور خوبصورت ترجمان ادا ہمارے ساتھ ماسکو سے آئی ہے۔ ایرپورٹ پر دو آذربائیجانی ادیب استقبال کے لیے موجود۔ ایک صاحب کا نام سلطان اوغلی ہے۔ نقاد اور فلم ڈائرکٹر۔ نہایت

خوش خلقی سے مسکرائے۔ میں نے بھی مسکرا کر سر ہلایا من ترکی نمی دانم۔

بذریعہ کار باکو۔ راستے میں سپاٹ میدان۔ ٹیلے اور جھاڑیاں اور جگہ جگہ پچھلی صدی کی نہایت کھٹارا قسم کی دقیانوسی مشینیں کھچڑ کھچڑ کر رہی تھیں۔ انکو بطور تاریخی یادگار نہ صرف برقرار رکھا گیا ہے بلکہ تکلفاً چلایا بھی جاتا ہے۔ جب یہ علاقہ مملکتِ ایران میں تھا تو شاہان قاچار کی عقل میں نہ آیا کہ پٹرولیم کشید کیا جائے۔ زار روس نے اسے ایران سے چھین کر فوراً اسکا تیل نکالنا شروع کر دیا۔ جب مسلمان اقوام اتنی نالائق ہو گئی تھیں تو یوروپین لوگ کیوں نہ توڑتے ان کے زجاج۔

دور افق پر ایک عمارت نظر آئی۔

"فیرفیتھ کا عبادت خانہ ہے۔" آدا نے سلطان اوغلی سے پوچھ کر بتایا۔

"فیرفیتھ کیا بلا ہے"؟ میں نے پوچھا۔ "فیرفیتھ ——— فیرفیتھ ———"
آدا نے دہرایا۔ "سلطان اوغلی سے کہو ترکی میں بتائیں۔ شاید میں سمجھ جاؤں"۔

"اوغلی صاحب نے جو فرفر آذری بولی تو "زرتشت" کان میں پڑا۔

"اوہو ۔ فائر فیتھ"

آذر بائیجان میں جگہ جگہ فاسفورس رات کو چمکتی تھی اور تیل کی گیس کے شعلے لپکتے تھے سب سے پہلے آتش پرستی یہیں شروع ہوئی۔

میڈین پروہت یہ مذہب ساتھ لے کر آٹھویں صدی قبل مسیح ایران گئے تھے۔ زرتشت نے اس رسم کو یزداں کے زمینی مظہر کی حیثیت سے برقرار رکھا۔ عہدِ عتیق میں یہ سارا علاقہ جس میں اصفہان اور طہران تک شمالی

ایران شامل تھا ماد کہلاتا تھا جسے یونانیوں نے میڈیا کہا۔ ہیروڈوٹس نے باکو کے "ابدی شعلوں" کا ذکر کیا تھا۔ ترک ساتویں صدی عیسوی سے براہ دربند آنا شروع ہوئے۔ بارہویں تیرہویں صدی تک اکا دکا آتشکدے باقی تھے۔ ہلاکو خاں کے حملے کی وجہ سے باقیماندہ مجوسی ہندوستان بھاگے۔ لیکن یہ عبادت خانہ جو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پارسیوں کا فائر ٹمپل نہیں تھا۔ اس میں سے سنسکرت اور گورمکھی کی تختیاں برآمد ہوئی ہیں یہ ان سندھی اور پنجابی ہندو تاجروں کا جوالا مکھی دیوی کا مندر تھا جو اٹھارہویں انیسویں صدی میں۔ براہ ایران یہاں چار شکر اور کپڑے کے کاروبار کے لیے آتے تھے۔ کمال ہے۔ میرے خیال میں یہ قدیم مجوسی آتشکدہ ہی رہا ہوگا۔ ویران پڑا ہوگا۔ آگ کی مناسبت سے ہمارے سندھی تاجروں نے اسے جوالا مکھی دیوی کا مندر بنا دیا۔

باکو دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے ہے اونچی عمارتوں کی شہ نشینوں پر انگور کی بیلیں۔ گلیوں کی دیواروں پر انگور کی بیلیں۔ عظیم الشان بندرگاہ چوراہے کے اوپر بہت بلندی پر استادہ شیشے کے کواٹسک میں بیٹھی پولس یونیفارم میں ملبوس ایک حسین آذری لڑکی اطمینان اور شگفتگی کے ساتھ ٹریفک کنٹرول کر رہی ہے۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے بادل گھر آئے اچانک اندھیرا چھا گیا۔

میرے کمرے کے سامنے چوڑی بالکنی ہے۔ دور جہازوں کے بیڑے نظر آ رہے ہیں۔ لنچ کے وقت ڈائننگ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ایک میز پر چند سیاہ پوش معمر خواتین بیٹھی ہیں۔

"یہ لوگ کون ہیں؟" میں نے سلطان ادغلی سے پوچھا۔

"پچھلی نسل کی چند مذہبی خواتین کوئی مذہبی سوگ منا رہی ہیں۔" ادغلی صاحب نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ (غالباً وہ کسی اثنا عشری امام کی شہادت کا دن تھا)

آرکیسٹرا نے مغربی دھن بجانی شروع کی۔ دریچوں کے باہر سیاہ بادل کیسپین کی موجوں میں گھل مل گئے۔ چند ہندوستانی پنجابی لڑکے جو یہاں تیل کی انجینیرنگ کی ٹریننگ لے رہے ہیں۔ رات کو ہماری میز پر آئے۔ یہاں ہندوستانی اتنے شاذ و نادر آتے ہیں آپ لوگوں کی آمد کی اطلاع سارے شہر کو ہو گئی ہے۔ کافی اکسٹیمنٹ ہے۔" انہوں نے کہا۔

صبح کی دھوپ نکل آئی۔ سمندر پر بندھے کئی میل لمبے اور پتلے چوبی پل پر سے گزر کر ہم لوگ اس جگہ پہنچے جہاں پانی سے تیل نکلا جاتا ہے۔

چیف انجینیر صاحب ہمارے منتظر تھے۔ مجھے تیل کی مشینوں سے کیا غرض میں دلچسپی سے ان سب انسانوں کو شکلیں دیکھا کی۔ ساری دنیا کے مستریوں کی طرح آذری فورمین کی کلائیاں بھی گدئی ہوئی۔ خوش باش۔ زبان سے مجبور مگر ہمیں دیکھ دیکھ کر باچھیں کھلی جاری ہیں۔ سمندر پر تختے باندھ کر انجینیروں کا پورا شہر آباد کر دیا گیا ہے۔

ایک تنہا کیبن کے اندر طرح طرح ڈائیل اور میٹر اور جانے کیا کیا عجیر العقول مشین لگی تھیں۔ چیف انجینیر صاحب کا خیال تھا مجھے ان کو ملاحظہ کر کے بہت خوشی ہوگی۔ بڑے تپاک سے مجھے تنہا اندر بھیجدیا۔ باقی سب لوگ باہر کافی

فاصلے پر ایک پلیٹ فارم پر جمع تھے۔

اب سمندر کے بیچوں بیچ ایک کوٹھڑی۔ انواع و اقسام کی پُر اسرار مشینوں سے پُر۔ اور میں وہاں نفقدم اکیلی موجود۔ سوچا اگر جو اسی لمحے چھڑ گئی امریکہ اور روس کے درمیان لڑائی۔ تیسری عالمی جنگ ——— تو کیا ہوگا۔ جنے یہ کیا وبال ہے۔ اس کیبن میں ایٹمی رازنہ ہوں۔ کیا ہوں، روس کا پُر اسرار ملک اور یہ خفیہ رازوں سے لبریز تیل کے کارخانے۔ اور ہم یہاں بیوقوفوں کی طرح اکیلے کھڑے ہیں۔ اتنے میں اسی کمرے کے برابر دوسرا کمرہ نظر آیا جس میں ایک نوجوان آذربائیجانی خاتون انجینئر اپنی ڈیوٹی پر مستعد بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ زبان حال سے خانم کو بتایا کہ میں ان کے وطنِ عزیز کے اس حیرت انگیز سائنسی ترقی سے باغ باغ ہوں۔ اور باہر آئی۔

اب گلِ سرخ طاقِ نیلوفری میں تیزی سے چمک رہا ہے۔ شہر سے بہت دور ایک تفریحی ساحل پر ٹوپیس کوسٹوم پہنے آذری عورتوں کا جم غفیر۔ ایک سمندری ریسٹوران پُل کے ذریعے ساحل سے ملحق ہے۔ وہ بھی لوگوں سے پُر۔ میزوں پر پھلوں اور شراب کی بوتلوں کے انبار۔ ہم لوگ ایک میز پر جا کر بیٹھے۔ کچھ دیر بعد ویٹر ایک ٹوکری فواکہات اور شراب کی بوتلوں کی لے کر آیا کہ اس میز سے بھجوائی گئی ہے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ ایک معمر خانم مع کنبے کی بیٹھی تھیں " او ہو یہ تو ہماری مشہور سرجن ظریفہ خانم ہیں " سلطان اوغلی نے کہا۔ میں نے آدا کے ساتھ جا کر ڈاکٹر ظریفہ خانم کا شکریہ ادا کیا۔ جواباً ڈاکٹر صاحب نے ہمارے جامِ صحت نوش کرنے

سلہ نظامی گنجوی

شروع کیے مجھے جام پیش کیا۔ اُدا نے ان کو سمجھایا کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ میں نے مسٹر نمبودری کو ظریفہ خانم کی میز پر بھیجدیا۔ ان کی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔

آذر بائیجان اپنی گرمجوشی خلوص اور مہمان نوازی میں اپنے کزن ترکوں سے مشابہہ ہیں۔ رستہ چلتے دوستی کریں گے۔ اپنے گھر مدعو کریں گے اور خاطریں کریں گے۔

مشہور فوٹو گرافر بلدیو راہیجا کو ہماری روسی سیاحت کی تصاویر کھینچنے کے لیے دلّی سے بھیجا گیا ہے۔ پوری سوویٹ قوم راج کپور پر عاشق۔ اور بے چارے بلدیو صاحب کی شکل راج کپور سے کافی ملتی ہے۔ وہ ساری پوشش خواتین اور ایک ہم شکل راج کپور۔ لہٰذا سڑکوں اور بازاروں میں زبردست بھیڑ اکٹھا ہونا روز کا معمول۔

اتوار کے روز جیا بین، نمبودری، بلدیو، آدا اور میں سمندر کے کنارے والی تفریحی سڑک پر مٹر گشت کر رہے تھے ایک آئیس کریم والے کے سامنے ٹھٹھکے۔ اب جو سر اٹھا کر دیکھا ہمارے گرد کوئی دو تین سو لوگوں کی بھیڑ جمع ہے۔ کچھ فاصلے پر مزید دو تین سو آذریوں نے بلدیو کو گھیر رکھا تھا۔ بلدیو اطمینان سے تصویریں کھینچتے رہے۔ سنتری مجمع میں سے کسی انگریزی داں کو بلالایا اس دوران میں مجمع بڑھتا گیا۔ اب بہت سے آذری گردنیں بڑھا بڑھا ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگے ادھر ہمارے گرد مجمع نے جو مجھے اور جیا بین کو گھیرے ہوئے تھا، "نہرو —— گاندھی —— اندرا گاندھی —— نرگس —— اللہ اکبر"

کا وظیفہ شروع کیا۔ غور کیجئے ان الفاظ میں کیا مناسبت تھی۔ بھیڑ اتنی بڑھ گئی
کہ دم گھٹا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک ہیٹ پوش صاحب نے ایک لڑکی
سے آذری میں کچھ کہا۔ لڑکی میرے قریب آکر انگریزی میں ان سب کی ترجمانی
کرنے لگی۔ اس کا نام شفیقہ اسماعیل تھا۔ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا ایم
اے کر رہی تھی۔ بھیڑ چھٹنے کے بعد پتہ چلا کہ اداپولس بین کو سمجھانے گئی تھی کہ بلدیو
صاحب سرکاری فوٹو گرافر ہیں۔ وہ ادھر سے شاداں و فرحاں تشریف لائے۔
ہم لوگ ہوٹل واپس چلے۔ شفیقہ اور اسکا شوہر بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔
بارش شروع ہو گئی۔ راستہ ایک جنگل نما پارک میں سے گزرتا تھا۔ ایک
تناور درخت کے نیچے ایک پکچر لیک سا چاد خانہ نظر آیا۔ ہم لوگ بارش
سے بچنے کے لیے اس میں گھس گئے۔ چوبی چاد خانے میں کرسیوں کے بجائے
درختوں کے تنے رکھے تھے۔ ایک مونچھیل آذری سماوار کے پاس بیٹھا تھا۔
اس نے خوب خاطریں کیں اور چاد اور سموسوں کے دام نہیں لیے۔ ان
چاد خانے میں ہم لوگوں کے علاوہ اس وقت صرف ایک شخص ایک کونے
میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ اٹھ کھڑا ہوا اور امریکہ کے خلاف دھواں
دھار تقریر بزبان انگریزی شروع کر دی۔ مونچھیل چاد خانے والا اسے سمجھا بجھا کر
باہر چھوڑ آیا اور آکر ہم سے کہا "بے چارہ نشے میں تھا"

باہر پارک کے فلک بوس درخت سمندری ہوا میں سرسرا رہے تھے
بارش تھم گئی تھی۔ عورتیں بچوں کی گاڑیاں دھکیلتی روشوں پر سے گزر رہی
تھیں اور دور سمندر پر دھند جمع ہو رہی تھی۔

شام کو ہم لوگ ایک کونسرٹ میں گئے۔ ایک نظر فریب باغ کے وسط میں بیحد عالیشان عمارت، آذریوں کی بھیڑ، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھی پیچھے دیکھا تو شفیقہ اور اسمٰعیل۔ شفیقہ کہنے لگی آپ نے بتایا تھا کہ شام کو یہاں آئیں گی ہم لوگ بھی آگئے کہ آپ سے ایک دفعہ اور ملاقات ہو جائے۔

پردہ اٹھا۔ جناب محمود سلماً نوف نے گانا شروع کیا۔ ترکی اور فارسی کے معجون مرکب میں چند الفاظ پلے پڑے جن میں لفظ محبّت پر بہت زور تھا۔ اور جیب محبّت ح کے بجائے خ کے تلفظ سے ادا کی جائے یعنی مخبّت۔ تو زیادہ زور دار ہو جاتی ہے۔ خوب خوب مرکیاں اور تان پلٹے انہوں نے لیے۔ آذربائیجانی کلاسیکل موسیقی بھی بحرِ ذخّار ہو گا۔ ان کے بعد بروکیڈ کے ایوننگ گاؤن میں ملبوس خانم تبسّم اسمٰعیلوا نے حافظ کی غزلیں گائیں۔ ایک نوعمر مغنی نے آذری میں امریکن کاؤبوائے گیت سنایا گٹار کے ساتھ۔

باکو کا میڈیول شہر گرینڈ اوپیرا کا عظیم الشان سیٹ معلوم ہوتا ہے۔ سلجوقی طرزِ تعمیر کے محلات مساجد، حمام۔ مقابر، سات منزلہ مینار جو ایک خاقان نے اپنی محبوبہ کے لیے بنوایا تھا۔ قلعہ جو معمار عبدالمجید بن مسعود نے ۱۲۰۳ء میں تعمیر کیا۔ دیوان خانے اور شیروان شاہ کے محل اور مساجد کے احاطے میں ترکی قبوں والے مزارات۔ گیارہویں سے پندرہویں صدی میں بنی ہوئی شیروان شاہوں کی عمارات۔ ایک تہ خانے میں مزید قبور۔ ایک کتبہ کہیں کہیں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ یا مجیب الدعوات —— زین العابدین ابن ابو——

—— شیروانی تہ خانے کا دروازہ سمندر کے رخ کھلتا ہے۔ اور سارے احاطے میں ہوائیں منڈلا رہی ہیں۔ باکو —— بادالکوبا —— ہواؤں کا شہر۔

نظامی تھیٹر میں شیریں وخسرو اور لیلےٰ و مجنوں کے اوپیرا اسٹیج کیے جا رہے ہیں۔

پرانے باکو کی اینٹوں کے فرش کی صاف ستھری گلیوں میں تنہا گھومتے ہوئے میں پرانے نوادر کی ایک دوکان میں گئی۔ ایک بوڑھا آذری نوادر میں گھرا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نجانے یہ سامان کن کن پرانے آذری آغاؤں اور پاشاؤں کے گھروں سے نکلا ہوگا۔ باہر خاموش سڑک پر ایک معمر آذری "اولڈ اسکول جنٹلمین" سر پہ پورک پائی ہیٹ، پورا سوٹ مع واسکٹ۔ چین والی جیبی گھڑی۔ ہاتھ میں چھڑی، ٹہلتا ہوا ایک پرانی افسانوی سی ڈیوڑھی میں داخل ہوکر غائب ہوگیا۔ جس کے اوپر انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔

اور نیا آذربائیجان۔ فیونی کلر ٹرین شہتوت کے پیڑوں سے ڈھکی ایک پہاڑی پر چڑھتی ہے جہاں بچوں کے پارک کا ایک ملازم بچوں کو برقی موٹروں میں بٹھا کر اس پیار سے کھلا رہا ہے گویا وہ اس کے ہی لختِ جگر ہیں۔ پہاڑی کے نیچے بولیوار میں پرانی وضع کی آذری پوشاک میں ملبوس کوچوان گھوڑا گاڑیاں لیے سیاحوں کے منتظر ہیں۔

سمندر کے قریب نہروں کے پارک میں جگہ جگہ خوبصورت پل۔ دو طرفہ ریسٹوران اور پویلین۔ شام کو یہاں درختوں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ موسیقی بجتی ہے لوگ باگ تیز رفتار کشتیوں پر سوار ہوکر نہروں کی سیر کرتے ہیں۔

آخری شام حسبِ معمول آذریوں کا ہجوم وہاں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ موٹر بوٹ چلانے والے نوجوان نے ہمیں سیر کے لیے مدعو کیا اور کرایہ لینے سے انکار کیا۔ چار پانچ لوگ مارے دوستی کے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے۔ لڑکے نے موٹر بوٹ نہروں پر دوڑانا شروع کی۔ آذری دوستوں نے ہمیں خوش کرنے کے لیے چند ہندوستانی فلمی گانے سنائے۔ دھنیں جانی پہچانی تھیں۔ اردو الفاظ آذری میں ترجمہ کر لیے گئے تھے۔ نہر کے دونوں طرف درختوں میں جاپانی قندیلیں جگمگا رہی تھیں اور گھنے باغ میں پوشیدہ کوشکوں اور چائے خانوں میں موسیقی بج رہی تھی۔ بہ ہر پنج گاہے دراں مرغزار۔ روانہ شدہ چشمۂ خوشگوار۔ ہوائے خوش و بیشہ ہائے فراخ درختاں بار آور و سبز شاخ۔ رواں آب در سبزۂ آب خورد چو سیماب بر پیکر لاجورد[1]۔

روانگی کے وقت آذری تحائف سے لدے سلطان اوغلی صاحب اور دوسرے آذری دوستوں کی آنکھوں میں آنسو۔ ایسی محبت شعار قومیں بھی دنیا میں موجود ہیں۔ باکو کبھی بھولے گا نہیں۔

دو انجنوں والا طیارہ بحیرہ کیسپین پر پہنچا پہنچا اڑتا مڈل ایشیا کی سمت چلا۔ ترکمانی کسانوں کا ایک کنبہ پوٹلیاں اور گٹھریاں سنبھالے باکو سے سوار ہوا تھا وہ شاید عشق آباد جا رہے تھے۔ باریش مولانا، ان کی شلوار پوش بیوی اور بہو۔ تین چار بچے جو مستقل رو رہے تھے۔ حلیے سے بالکل پشاوری پٹھان کنبہ معلوم ہو رہا تھا۔ چند روسی فوجی نوجوان۔ ایک جوان خاتون سیاہ فراک میں ملبوس۔ سیاہ جالی کا نقاب جو مغرب میں سوگ کی نشانی ہے اور سرمئی لپ اسٹک۔

[1] نظامی گنجوی۔ سکندر نامہ

آنکھیں روتے روتے سرخ ہو رہی تھیں اس آنجہانی کی تصویر انہوں نے بروچ کی طرح سیاہ فراک کے کالر پر لگا رکھی تھی۔ آنجہانی ادھیڑ عمر کا خوش شکل سا شخص تھا۔ نجانے اس بے چاری کا شوہر تھا کوئی اور قریبی عزیز! لیکن وہ سوگوار خاتون جس انداز سے نظریں سامنے جمائے ناک پر رومال رکھے باکو سے طیارے پر سوار ہوئی تاشقند تک بالکل اسی منجمد پوز میں بیٹھی رہی ۔

ترکمان مولنا اور ان کی بیوی بالکل میرے پیچھے فروکش تھیں۔ ادا ہوائی سفر سے دہشت زدہ سارے وقت آنکھیں میچے بیٹھی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دور ایک کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ جیا بین نمبودری اور بلدیو قریب کی کرسیوں پر براجمان تھے۔ اتنے میں یوروپین روسی ایرہوسٹس لنچ لے کر آئی ۔ ایک پلیٹ میں کولڈ کٹس کا انبار۔ ادا بیچاری بیٹھی تھی۔ اسے جگانا میں نے مناسب نہ سمجھا اب کس طرح معلوم کیا جائے کہ کولڈ کٹس کے انبار میں کون کون سے جانور کا گوشت ہے۔ اگر سؤر ہے تو میرے لیے بیکار۔ گائے ہے تو مسٹر بلدیو اور جیا بین نہیں کھا سکتے۔ سارے ہوائی جہاز میں کسی کو ایک لفظ انگریزی کا نہ آئے۔ میں نے ایر ہوسٹس سے پوچھنے کی کوشش کی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ روسی قوم چونکہ ایک بے تکلف اور خوش باش قوم ہے سارے طیارے میں خبر پھیل گئی کہ میرے سامنے ایک مسٔلہ درپیش ہے مسافروں نے اٹھ اٹھ کر امداد کے لیے آنا شروع کیا۔ فوجی افسر لڑکوں نے مدد کی کوشش کی۔ سب بیحد خوش اور ایک تفریح۔ آخر میں نے کاغذ

نے نیپکین پر سور کی تصویر بنائی۔ اس وقت جہاز نے زور سے غوطہ کھایا اور سور گائے بن گیا۔ وہ نیپکین ایر ہوسٹس اور سارے مسافروں نے باری باری ملاحظہ کیا سمجھ میں نہ آیا۔ بحیرہ کیسپین کے اوپر گہرے بادل تھے باد و باراں میں طیارہ مستقل غوطے کھا رہا تھا اسی عالم میں میں نے نیپکین پر دوسری تصویر گائے کی بنائی جہاز نے ایسی قلابازی کھائی کہ گائے سور بن گئی۔ اس وقت تک سارے مسافر اپنا اپنا لنچ ملتوی کر کے گائے اور سور کا پرابلم حل کرنے میں مصروف تھے اچانک مجھے ترکمان مولنا کا خیال آیا۔

"مولنا۔ السلام علیکم" میں نے گوشت کی پلیٹ انکو دکھا کر پوچھا "لحم خنزیر ــــــ؟" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا "لحم بقر ــــــ؟" انہوں نے ترکمانی میں کچھ کہا اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا ــــــ" مسلمان ہستم" فوراً خوش ہو کر فرمایا "الحمدللہ"

میں نے یلدیو اور جیا ہین سے کہا اب تم لوگ سلاد کھاؤ۔ میں تو آرام سے بھوجن کرتی ہوں۔

وادیٔ زرفشاں

عشق آباد (ترکمانیہ) میں طیارہ میری وجہ سے آدھ گھنٹہ لیٹ ہوا کیونکہ میں ایک دوکان سے چینی پیالے نکلوانے میں منہمک تھی۔ فرغنہ کی سرسبز وادیوں پر نیچا نیچا اُڑتا طیارہ تاشقند پہنچا جو روس کا ایک اہم ہوائی اور ریلوے جنکشن ہے۔

باہر ٹیکسی میں بیٹھتے ہی گول ٹوپی والے ازبک ڈرائیور نے کہا۔ "السلام علیکم"۔ شہر کی فضا کچھ شمالی ہند جیسی۔ ہوٹل تاشقند کے سامنے سے دھاری دار ریشمی لبادوں اور گول ٹوپیوں والی عورتوں اور لڑکیوں کے غول گزر رہے ہیں۔ ہوٹل کی دوکان میں علی شیر نوائی اور سب سے پہلے بڑے چغتائی ترکی مصنف ظہیر الدین بابر کے مجسمے۔ (یہ مصنف ہندوستان بھی آیا تھا)۔ ہر ازبک فل بوٹ پہنتا

ہے۔ طہران میوزیم میں ـــــ بادشاہ مہرگل کا مجسمہ دیکھا تو وہ بھی فل بوٹ پہنے کھڑا ہے۔ جنے کیا مصیبت ہے۔ ازبک علمار مولانا سب فل بوٹ میں اس وقت نہ بارش ہو رہی ہے، نہ برفباری۔ نہ یہ شہسوار ہیں۔ حد یہ کہ ضعیف خواتین شلواروں پر فل بوٹ ڈاٹے چلی آ رہی ہیں۔ پرانا تاشقند۔ صاف ستھری گلیوں کے اندر چاد خانوں میں لوگ باگ تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ جامع مسجد کے صحن میں گلاب کھلے ہیں۔ ایک بوڑھا ازبک ایک برآمدے میں اکیلا بیٹھا وضو کر رہا ہے۔ مسجد سے ملحق عمارت پر "الادارۃ الدینیہ المسلمی آسیا الوسطیٰ۔ اور تا، آسیا قازاخستان مسلمانلیری دینی باشعار مدسی" اور جانے کیا کیا لکھا ہے ـــــ میں نے دروازے کے شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا یوروپین اسٹائل پلنچ کی میز سجی ہوئی تھی۔ جو رڈن کے گرینڈ مفتی آنے والے تھے۔ اور ازبک مولانا لوگ ان کو یہاں کھانا کھلا رہے تھے۔

بوڑھے ازبک مالی نے مجھے چند گلاب توڑ کر دیے۔ "رحمت" میں نے کہا جو ازبک میں شکریہ ہے۔ شہر کے پرانے بازار میں ہنگامہ سودا بیچنے والوں کی چیخ پکار (چھوٹے پیمانے پر ذاتی تجارت کرنے کی اجازت ہے) ایک نان فروش اپنے گاہک سے جھگڑ رہا تھا۔ بازار میں ہماری آمد سے ہنگامے میں اضافہ ہو گیا۔ چند لڑکیوں نے گھیر کر شستہ انگریزی میں پوچھا ـــــ "انڈین سینما آرٹسٹ؟"

چھینٹ کی شلواریں پہن بوڑھی ازبک عورتیں زمین پر بیٹھی ترکاری بیچ

رہی ہیں۔

تاشقند سے باہر ایک چلن زار یعنی شہتوت کا باغ ایک اجتماعی فارم۔ چند مکان بوسیدہ۔ ہر صحن کے اندر پھلوں کا باغ۔ ایک جگہ موٹر روک کر اجتماعی فارم کے انڈیک ڈائریکٹر نے کہا آپ یہاں جس ڈیوڑھی کے اندر چاہیے چلی جایئے۔

ایک دہلیز پر ایک بوڑھی عورت چھینٹ کی شلوار قمیص پہنے۔ موٹے شیشوں کی عینک لگائے۔ چپ چاپ بیٹھی تھی میں نے اسی مکان کا رخ کیا۔

ڈیوڑھی کے اندر بھوسہ پڑا تھا اور ایک تخت۔ اندر بڑا سا مکان لکڑی کا بورژ دوسرے سرے پر باورچیخانہ گودام اور اصطبل۔ کسان کی بیوی گائے کی سانی میں مصروف۔ بے شمار بچے۔ کمرہ نشست میں دبیز قالین۔ ایک طرف ریشمی لحافوں توشکوں کے انبار۔ الماری میں چینی کے برتن۔ ایک کونے میں ٹیلی ویژن۔ باورچیخانے میں گیس کا چولہا۔ صحن میں جنگلے دار تخت جو ہر ازبک گھر میں ہوتا ہے۔ کسان کے بچے نے دلربا پر ایک گیت سنایا۔ بوڑھی دادی اماں ڈیوڑھی سے آکر برآمدے میں تخت پر بیٹھ گئیں۔ سامنے رحل میں انکا قرآن شریف رکھا تھا۔ ان کا بیٹا یعنی صاحبِ خانہ کمیونسٹ پارٹی کا اور پوتے پوتیاں ینگ کمیونسٹ لیگ کے ممبر تھے۔

ایک گاؤں میں جہاں ایک تیز رو ندی کے دونوں طرف سفیدے کے درخت کھڑے تھے کسانوں کے ریسٹ ہوم میں پہنچے۔ نہروں کے پانی پر بنے ہوئے پویلین بابر کو ہندوستان میں یاد آئے۔ اور یہی ایرانی اور مغل

میناتور میں نظر آتے ہیں۔

ایک پویلین میں لنچ کے لیے میز سجی تھی۔ فواکہات کا انبار۔ نان اور دوسری نعمتیں۔ تیز روندی ہمارے کرسیوں کے نیچے سے بہتی جا رہی تھی۔

سمرقند نے مایوس اور ملول کیا۔ ریگستان اسکوائر بی بی خانم کا مقبرہ اور مسجد۔ گمنام نقشبندی خانقاہیں۔ شاہ زندہ کے مقبرے میں سرخ رومالوں والے ازبک ینگ پائنیر بچوں کا گروہ اپنی استانی کے ساتھ گھومتا پھر رہا تھا۔ الغ بیگ کی رصدگاہ سمرقند میوزیم میں خوانینِ بخارا کے فارسی فرامین۔ شیبانی خان کی تصویر جو ازبک ہیرو ہے۔ (اس نے بابر کو ہندوستان بھگایا) افراسیاب کی یادگاریں۔ رستم ایران کا کلچر ہیرو ہے تو افراسیاب توران کا کلچر ہیرو کیوں نہ ہو۔

گورِ امیر کی مرمت کی جا رہی ہے۔ اندر عجیب ہیبت سی طاری تھی۔ سنگِ سیاہ کا لمبا مزارِ تیمور۔ آس پاس شہزادوں اور خانموں کی قبریں۔ باہر سڑکوں پر بوڑھے ازبک سیخ کباب بیچ رہے ہیں۔ ایک بازار سے گزرتے ہوئے لتا منگیشکر کی آواز سنائی دی۔ سمرقند کے بازار میں لتا کا فلمی گیت۔ تو گولڈن سمرقند کو قصۂ ماضی سمجھو۔

اب ہوائی اڈّے پر گھنٹوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ جو چھوٹا طیارہ ہمیں ماسکو لے جانے والا ہے اسے بلانے کے لیے الماتا تار دیا جا چکا ہے۔ وہ وقت پر نہیں آیا۔ دوسرے طیارہ جو اس وقت ماسکو جا رہا ہے اس میں جگہ

نہیں ہے۔ ہمارے میزبان عطا اللہ صاحب دوڑ بھاگ میں معروف ہیں۔ آپ لوگوں نے اتنی حیرت انگیز ترقی کرلی اور پھر یہ کنفیوژن۔ میں نے ان عطا اللہ شاہ بخاری سے جھنجھلا کر کہا۔ دیہاں کام چلاؤ فارسی میں کام چل جاتا ہے، عطا اللہ صاحب جھینپ کر سرخ ہو گئے۔ پھر انہوں نے ماسکو جانے والے پانچ روسی مسافروں کو ہماری خاطر اتروا دیا۔ "ارے آپ نے یہ کیوں کیا"؟

"آپ ہماری معزز مہمان جو ہیں" عطا اللہ شاہ بخاری نے کہا۔
طیارہ پر پھیلا کر وادیٔ زرفشاں سے اٹھا اور ماسکو کی طرف اڑا ——

بلیک ٹیوُلپ

مئی - جون ۱۹۷۴ء - تیز نیلی خلیج فارس - سعودی عرب کی زرد آؤٹ لائن - جنوبی ایران کے خشک پہاڑوں کا مون اسکیپ - فرودگاہ مہرآباد طہران۔ اچانک خوشگوار خنکی - سامنے کوہ دماوند - لمحہ بہ لمحہ فوجی طیارے پرواز کر رہے ہیں - کوہ البرز - جنوبی روس - ماسکو -

میرے ساتھ مراٹھی ڈرامہ نگار وجے تندولکر اور ہندی نقاد ڈاکٹر وجے پال سنگھ دلّی سے آئے ہیں۔

"ایرپورٹ پر ہمیں لینے کوئی نہیں آیا - یہاں سے لیڑیا کیسے جائیں گے؟" دونوں حضرات نے گھبرا کر کہا - میں نے بحیثیت روس کی ایک دیرینہ سیاح ان کو دلاسہ دیا - اتنے میں ایک بیرونی دریچے ایک ماہرِ روسی لڑکی سموری

ٹوپی پہنے گلدستہ سنبھالے جھانکتی نظر آئی ——

"یعنی —— ! آداب عرض ہے" اس نے اردو میں کہا۔

وجے تندولکر اور ڈاکٹر سنگھ نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ اب وہ یوں گویا ہوئی: "میرا نام ایرا میکو دا ہے۔ میں آپ کی ترجمان ہوں۔ ہم لوگ دو گھنٹے بعد سیدھے ریگا جائیں گے پہلے شہر چل کر لنچ کھا لیجئے۔"

میں ایرا سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ وجے تندولکر نے پوچھا "مس حیدر کو آپ کیسے پہچان گئیں ؟"

"میں آگ کا دریا پر ماسکو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے کام کر رہی ہوں۔"

میں نے فوراً طے کیا اس شریف لڑکی کو اس ریسرچ سے باز رکھنے کی پوری کوشش کروں گی۔ کوئی بہتر کام کرے۔

آج ۱۲ ر مئی تھی۔ ۷ مئی کو میرے پاس منسٹری آف کلچر نئی دہلی کا تار پہنچا: "کیا آپ ریگا میں منعقد ہونے والی روسی، ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی ادیبوں کی کانفرنس میں ہندوستان کی طرف سے شرکت کرنا پسند کرینگی"؟ فوراً دلی پہنچے۔ دلی میں مجھے وجے تندولکر اور مسٹر سنگھ کو معلوم ہوا کہ لیٹویا میں کانفرنس شروع ہو چکی اور ۱۲ ر مئی کو اسکا آخری سشن ہے۔

ایرپورٹ سے ماسکو کے راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ رائیٹرز یونین کے خوش منظر محلے میں پہنچتے پہنچتے سڑکوں پر پانی ہی پانی تھا۔

کلب کے برابر کاؤنٹ روسٹوف والا زرد محل مینہ میں بھیگ رہا تھا۔

ڈرائیور نے کار احاطے میں چیری کے درخت کے نیچے کھڑی کر دی۔ ہم لوگ ایک پہلو کے دروازے سے رائیٹرز کلب میں گئے۔ کھانے کا وقت تھا سارے کمرے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایرا بھاگ کر ایک فرانسیسی ترجمان لڑکی کو بلا لائی اور خود ریگا کے لیے روبلز کا انتظام کرنے کاؤنٹ روستوف کے محل بھاگی ——— فرینچ ترجمان خاتون کی انگریزی واجبی تھی میری فرینچ واجبی انہیں بتایا کہ ڈاکٹر سنگھ کون کون سی ممنوع اشیا، نہ کھائیں گے۔ کمرہ قہوے اور گرم کھانوں کی بھاپ سے معمور تھا۔ باہر بارش کی دھند امن اور تحفظ کا وہ احساس جو مغرب کے طعام خانوں میں ایسے موسم میں ہوتا ہے۔ جب باہر مینہ برستا ہو یا برف پڑتی ہو یا گہری دھند چھائی ہو۔

شمال مغرب کی طرف جانے والے طیاروں کے ایرپورٹ پہنچتے پہنچتے سورج نکل آیا۔ لیٹویا کا ہوائی جہاز بہت دور میدان میں کھڑا دھوپ میں چمک رہا تھا۔

شمالی یوروپ کی سرزمین۔ شمالی جرمنی سے ملتی جلتی۔ لینڈ اسکیپ بدل گیا۔ شہر ریگا سے بیس میل دور مشہور صحت گاہ یرماکلا کے راستے میں پرانے کنٹری ہاؤس جن میں پہلے لیٹوین کاؤنٹ رہا کرتے ہوں گے۔ جھیلیں۔ خوبصورت مکانات۔ رومن رسم الخط میں سائن بورڈ۔ سلاوروسی تہذیب کے بجائے ٹیوٹنک جرمن کلچر کی چھاپ۔

بالٹک کے کنارے شاہ بلوط اور صنوبروں میں گھری شاندار الٹرا ماڈرن عمارت۔ رائیٹرز ہوم۔ باغ میں سیاہ لالہ کے تختے۔ ایک وسیع ہال میں جس

کی تین طرف دیواریں پلیٹ گلاس کی ہیں۔ کانفرنس کا آخری اجلاس بھی ختم ہونے والا تھا۔ فیض صاحب طویل بیضوی میز کے سرے پر چرمی کرسی پر بیٹھے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حسب عادت بڑے اطمینان سے پوچھا "ارے بھئی تم بہت دیر میں آئیں"

"آداب فیض صاحب۔ اور کون کون آیا ہے پاکستان سے؟"

"ہم آئے ہیں۔ کیا ہم کافی نہیں؟"

میں اپنے نام کی تختی کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی۔ سامنے قطب شمالی کا سرخ سورج بہت نزدیک سے میز پر جھانک رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ آج صبح چار بجے میں دہلی میں تھی۔ بیچ میں تین چار گھنٹے ماسکو ٹھہرتے ہوئے شام کے چھ بجے ملک لیتھویا۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب زمین کی طنابیں کھنچ جائیں گی سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ الحاد کا بول بالا ہوگا اور بھائی بھائی کو نہ پہچانے گا۔

بنگلہ دیشی ادیبوں کی قطار فیض صاحب کے مقابل میں بیٹھی تھی۔ ان کے قائد نے اپنی طویل تقریر جاری رکھی ملیالم مصنف تکازی پلّے کے نزدیک بنگلہ دیشی خاتون بیٹھی تھیں۔ نیلی کارچوبی ساڑی۔ بڑا سا جوڑا۔ ماتھے پر سرخ بندی۔ نام بدرالنساء عبداللہ ان کے بعد ازبک تاتار تاجیک، منگول، کرغیز اور روسی ادیب لوگ۔ بنگلہ دیشی لیڈر ڈاکٹر مظہرالاسلام کی تقریر کے بعد پاک، و ہند و بنگلہ دیش کے مابین امن و مفاہمت کی اشد و فوری ضرورت پر ایک مختصر بھاشن فی البدیہہ دینے کے لیے میں نے سامنے

دکھا مائیک قریب کھسکایا۔ فربہ انگریزی مترجم فوراً میرے پیچھے آن بیٹھا۔ فیض صاحب بدستور مہاتما بدھ کی طرح بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ غلط۔ مہاتما بدھ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔

میرے کمرے کے نیچے گہرا نیلا بالٹک صنوبر کے جنگل۔ ساحل۔ افق پر میڈیول گرجاؤں کے فلک بوس برج کمرے میں ہر شئے موجود۔ میز کاغذ۔ ٹائپ رائیٹر۔ ریفرنس کی کتابیں۔ فریجڈیر میں پھل فروٹ۔ چاکلیٹ۔ آرام نال رہو بالٹک سمندر دا نظارہ کردے تے لکھو۔

اب رات کے ۹ بجے ہیں۔ سورج اسی تیزی سے چمک رہا ہے۔ ایک خواب ناک کلیسا میں ایک فرانسیسی (عنوان نوازد بالکل حجاب امتیاز علی کا جملہ ہوگیا) ارغنوں بجانے میں مصروف ہے گرجا کے ہال اور چوک میں جم غفیر ریگا ایک موسیقی پرست شہر ہے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا یعنی عظیم الجثہ ارگن جو بارہویں صدی کے اس کلیسا میں موجود ہے۔ اس پر اب لادینی موسیقی بجائی جاتی ہے۔ جہاں لاٹ پادری کھڑا ہو کر وعظ کہتا تھا وہاں ایل۔ پی ریکارڈ بک رہے ہیں۔ اوپر بالکنی میں جہاں شاہان لیٹویا بیٹھ کر عبادت کرتے تھے ہم جنتا کے لوگ بیٹھے چاکلیٹ کھا رہے ہیں۔ آدھ گھنٹے تک ارغنوں بہت اچھا لگا۔ اسکے بعد میں نے اس ساز کی موسیقی کی گہرائی، پھیلاؤ وغیرہ پر غور کرنے کی کوشش کی۔ پھر چاروں طرف نظریں دوڑا کر میڈیویل لیٹوین گوتھک طرزِ تعمیر۔ افریسکوز وغیرہ پر سوچ بچار کیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر مظہر الاسلام آف

بنگلہ دیش اور ڈائرکٹر جے پال سنگھ باآواز بلند خراٹے لے رہے تھے۔ میں نیچے ہال میں بیٹھے ہزارہا سامعین کو دیکھ کر متاثر ہوئی کہ کس قدر کلچر پرست قوم ہے پیچھے نظر ڈالی تو سنگلاخ دیوار کے کونے میں ایک سرنگ نظر آئی۔ چپکے سے اٹھ کر دیکھا۔ سرنگ کے اندر جا کر کو ئیاں خفیہ گیلری اور چور زینہ نظر آیا۔ قرونِ وسطیٰ میں یہاں بادشاہ اور کلیسا کے مابین یا ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہوتی ہوں گی قتل ہوتے ہوں گے یعنی مرڈر ان دی کیتھڈرل. میں نے سرنگ میں جا کر تنگ زینہ اترنا شروع کیا جس میں ایک مدھم بلب روشن تھا۔ زینہ تنگ اور سرد اور پتھریلا اور قلعہ دولت آباد اور فتح پور سیکری کے زینوں سے زیادہ پراسرار معلوم ہوا۔ سیڑھیاں اترتے اترتے خیال آیا جیسے پانچ سال قبل باکو کے بحری تیل کے کنٹرول روم میں خیال آیا تھا کہ فرض کرو ایک عدد سی۔ آئی۔ اے ایجنٹ یہاں چھپا ہوا ہو۔ اور وہ نکالے پستول اور ریوں گویا ہو۔ روسیوں کے جو رازہائے سربستہ تم کو معلوم ہیں فوراً بتاؤ۔ سب مرین سمندر میں موجود ہے فوراً فن لینڈ پہنچا دے گی۔ میں یہ سب تصور کرتے کرتے سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ بالآخر ایک روشن دروازہ نظر آیا جو کیتھڈرل کے ہال میں کھلتا تھا۔ کونسرٹ ختم ہو چکا تھا۔

فرانسیسی موسیقار کہ اب تک پردۂ حجاب میں تھا اب سامنے آ کر جھک جھک کر لامتناہی تالیوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ مجمع بکھرنا شروع ہوا۔ میں نے اوپر نظر ڈالی۔ شاہی بالکنی خالی ہو چکی تھی۔ میں نے ہال کے انبوہِ کثیر میں ساتھیوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ کہیں نہ ملے۔ اتنے میں فریہ انگریزی ترجمان

بھیڈ چیرتا بھاگتا ہوا آیا اور کتابی اردو میں بولا "بی بی جی جملہ مصنفین آپ کے متلاشی ہیں" یہ روسی نوجوان انگریزی کا ترجمان تھا مگر کتابی اردو ہندی بھی خوب بولتا تھا۔ ایرا نہایت با محاورہ فرماٹے کی اردو بولتی تھی اور لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھ کر آئی تھی۔

کلیسا سے ملحق خانقاہ اور شاہی قبرستان کے صحن چمن میں لوگ باگ ٹہلتے پھر رہے تھے باہر گول پتھروں کے فرش والے چوک میں زرد چوٹیوں والی نورڈک لڑکیاں اور سن کے سے پیلے بالوں والے نوجوان لالہ کے گلدستے سنبھالے ہنستے بولتے گزر رہے تھے۔ بالٹک اسکینڈے نیوین گوتھک کائنات۔ آدھی رات کے آسمان پر دودھیا اجالا پھیلا ہوا تھا۔

TWILIGHT OF THE GODS

یہ واگنر کی موسیقی کی دنیا تھی۔

اور صبح کو شیشے کی دیواروں والے ہال میں بریکفاسٹ کی میز پر دوشنبہ کی تاجیک شاعرہ گلرخسار صفیوا حافظ کے رنگ میں کہی ہوئی اپنی تازہ عشقیہ غزل سناتی ہے۔

ماسکو میں ایک دفعہ پھر کوہ قفقاز جانے والے طیاروں کا ایرپورٹ۔

وہینڈسم جارجین لڑکے چوکلیٹ کے ڈبے ہاتھ میں لیئے طیارے میں آئے چوکلیٹ مسافروں کی دی اور ہنستے ہوئے کوک پٹ میں چلے گئے "بڑے خوش اخلاق پائلیٹ ہیں۔" میں نے ایرا سے کہا۔

"جارجین بہت خوشدل اور پرخلوص لوگ ہیں" ایرا نے جواب دیا۔ یوروپین

روسی پوشکن ٹالسٹائی اور چیخف سمیت اور ان کے زمانے سے کوہستان قفقاز کے باشندوں کو بہت رومینٹک سمجھتے ہیں اور ان کے مداح ہیں۔

اب جارجین ایرہوسٹس نے مسافروں کو مٹھائی اور شطرنج کے ڈبے اور بورڈ تقسیم کیے۔ مزید آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ جہاز چل کر ہی نہیں دیتا۔ ایک گھنٹہ گذر گیا۔ پچھلے حصے میں کافی گہما گہمی تھی۔ ڈاکٹر سنگھ بہت گھبرا رہے تھے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب اب بھی وقت ہے ریل سے طلبسی چلے جایئے یہاں کچھ بھروسہ نہیں۔ کل کے چھوکرے پائلیٹ۔ لمبا سفر۔ اوپر آسمان جس پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بھگوان بھی نہیں ہے۔ نیچے پہاڑ ہی پہاڑ۔ اور جہاز یہیں سے نہیں اڑ رہا۔ لڑکوں کو چلانا نہیں آرہا؟" معلوم ہوا ایک صاحب کا اسباب جو کہیں اور جا رہے تھے غلطی سے اس طیارے میں آگیا تھا اور وہ اب تک ڈھونڈا جا رہا تھا۔ روسی خصلتاً کافی ہندوستانی ہیں۔

قفقاز کے حسین ترین پہاڑوں پر سے نیچے نیچے اڑتے ہوئے جہاز پریوں کے دیس چلا۔ کوہ قاف۔ بنگلہ دیشی وفد خاموش اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب محمد الیاس چونچال اور خوش خلق آدمی تھے ایک نوجوان راحت خاں صاحب سب سے زیادہ سنجیدہ صورت تھے مگر وہ شطرنج کھیلتے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ شطرنج شروع کی۔ اچھا کھیلتے تھے حسب معمول دو تین روسی مسافر قریب آکر کھیل دیکھنے لگے۔ روسی قوم کو شطرنج کا خبط ہے۔ نیچے آبشار۔ بادل۔ دلفریب کوہسار۔ روپہلی ندیاں۔ اسی جگہ کو سفید فام نسلوں کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔

سحر گرجستان

کوہ قاف کے دو پری زاد رائٹر طبلسی ایر پورٹ پر موجود تھے ان کے ساتھ ہم لوگ ہوٹل آئیوریا پہنچے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے اور چاروں طرف بیحد تیز ہوا چل رہی تھی۔ طبلسی یا بلسی جو پہلے طفلس کہلاتا تھا اور استالن کا وطن ہے باکو کے مانند ایک حسین افسانوی شہر ہے۔ تیز رو پہاڑی ندی کرا چوڑی نہر کی طرح بہتی ہوٹل کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سامنے سرسبز شہر۔ گرجا۔ پرانے مکانات۔ جدید ترین عمارتیں ایک پہاڑی کی چوٹی پر استادہ مدرجارجیا کا بلند و بالا مجسمہ، آرمینیہ کی طرح یہاں بھی قوم پرستی کا بہت زور ہے۔ انکا رسم الخط بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ اور ان کی منفرد زبان دنیا کے کسی لسانی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی۔ جارجین سرحدی پٹھانوں یا پنجابیوں کی قسم کے لوگ ہیں۔ مہمان نواز۔ جذباتی، فراخدل اور خوش باش اور ایک جنگجو پہاڑی قوم کی

یثیرت سے لڑائی بھڑائی اور سورمائی کی زبردست روایات کے مالک۔
ایک زمانہ تھا کہ یہ جنگجو جارجین عیسائی اور ان کے ہمسائے جنگجو مسلمان داغستانی
اور آذری وغیرہ مستقل ایک دوسرے سے لڑا بھڑا کرتے تھے۔ جارجین بیحد
پیکڑ ہیں کھانے کی میز پر بار بار کھڑے ہو کر جامِ صحت نوش کرتے ہیں جارجین
ٹوسٹ "جامِ صحت سارے روس میں مشہور ہیں۔ دنیا کے قدیم ترین مسیحی ملکوں
میں سے ایک جارجیا تھا۔ سونے اور جواہرات کی پہاڑوں میں فراوانی۔ سینکڑوں
مذہبی تصاویر سونے اور ہیرے جواہرات سے مزین عجائب خانوں اور گرجاؤں
میں رکھی ہیں۔ میری ایک بیوقوفی کی تھیوری یہ تھی کہ اس ملک میں گرجاؤں
کی بہتات کی وجہ سے عربوں نے اسے گرجستان کہا ہوگا (اسکا دوسرا عرب
نام جرجان ہے) اب جو غور کیا تو اچانک انکشاف یہ ہوا کہ جارجیا سینٹ جارج
کے نام پر آباد ہے۔ جارج کو عربی میں گرجیس یا جرجیس کہا جاتا ہے۔ (ایک حضرت
جرجیسؑ نبی بھی قصص الانبیاء میں موجود ہیں) لہذا گرجستان۔

آذربائیجان کی مانند یہاں بھی سیاحوں کے لیے مصنوعی خنجروں اور تلواروں
پستولوں کا بہت نذر ہے۔

طبلسی کے اکثر پرانے محلے طہران کی یاد دلاتے ہیں۔ وہی کلچر بیلٹ
ہے اور علاوہ ازیں جارجیا ایران کا بھی ایک صوبہ رہ چکا ہے۔ ان کے سولہویں
سترھویں صدی کے میناتور عین میں صفوی ایرانی میناتور کا پر بہ ہیں۔ بالخصوص
شاہنامہ فردوسی کا جارجین مصوّر ترجمہ، نظامی کی یوسف و زلیخا وغیرہ بقیہ پرانی
تصویری میں ایرانی اسلامی اور بازنطینی مسیحی روایات کا اثر جھلکتا ہے۔

فِرنی کلر ریلوے اور بجلی کی جھولے والی کرسیوں اور کاروں کے ذریعے ہم ان سرسبز پہاڑوں پر گئے جہاں قدیم گرجا گھروں اور خانقاہوں میں جارجین آرٹ کے یہ نوادر محفوظ ہیں۔ ایک پہاڑی کے دامن میں ایک جارجین پکنک منا رہا تھا۔ قومی کھاجا۔ نان، ابلے انڈے، شہد اور شراب کی بوتلیں چادر پھیلائے بیٹھے تھے اور مصر تھے کہ ہم ان کی شرکت کریں۔ کہیں سے گٹار بجاتے دو نوجوان نمودار ہو گئے اور سب نے مل کر گانا اور رقص کرنا شروع کر دیا۔ ایرا ان کے جارجین فوک ڈانس میں شامل ہو گئی۔ ہم لوگ پہاڑی پر چڑھے۔ ایک طرف ایک قلعہ نظر آرہا تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں مسلم عرب حملہ آوروں سے مدافعت کے لیے بنایا گیا تھا۔ بلند و بالا تاریک درختوں میں چھپے چھٹی صدی عیسوی کے ایک گرجا کا کافی حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ ہم لوگ موم بتیاں جلا کر اس کے تہ خانوں میں اترے۔ ایک تہ خانے میں ایک ہزار برس پہلے ایک ایسا چیف راہب رہتا تھا جس نے پچاس برس تک سورج کی روشنی نہیں دیکھی۔ اور یہیں مر گیا۔ اس کا تابوت مع ڈھانچے کے کوٹھڑی میں اس طرح رکھا تھا۔ ایک اور تہ خانے میں راہبوں کی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کا انبار نظر آیا۔ ان زمین دوز کمروں اور گیلریوں میں جنگل کی ہوا سیٹیاں بجاتی پھر رہی تھی اور فرش پر بکھری کھوپڑیوں میں راہب اب بھی موجود تھے۔ ذرا اونچائی پر ایک اور کتھیڈرل استادہ تھا۔ شکستہ گرجا مسلمانوں کی آمد سے قبل کا تھا یہ دوسرا کتھیڈرل مسلم دور کی یاد دلا رہا تھا کیونکہ اس کے فرش پر جو سنگ مزار تھے ان سب پر اسلامی محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ بہت اوپر ایک روشندان کے پاس

"خدائی آنکھ" منقش تھی جو بغیر پلک جھپکتے اس ویران کلیسا کو تک رہی تھی۔

طبلسی سے باہر ایک اور پرانا کیتھڈرل احاطے میں جارجین سیاحوں کا ہجوم۔ اندر ہال میں شمعیں فروزاں ہیں جو گرجا میوزیم بنا دیئے گئے ہیں ان میں شمعیں بطور روایت و آرائش روشن کی جاتی ہیں۔ ہال کا فرش مزاروں سے پٹا پڑا تھا۔ مسیحی ممالک کا قاعدہ تھا کہ ان کے بادشاہ مشاہیر اور بڑے پادری گرجا کے اندر ہی فرش کی سطح کے نیچے دفن کیے جاتے تھے۔ بارہویں صدی کے اس کیتھڈرل میں قربان گاہ کے عین نیچے مجھے ایک کتبہ عربی میں لکھا نظر آیا۔ میں نے بیٹھ کر غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔ کتبے کا نصف حصّہ اولڈ جارجین میں تھا نصف عربی میں جو کافی مٹ چکی تھی۔ "ابن ملک شاہ ــــ" اور چند جملے۔ مشکل پہچانے جا سکتے تھے۔ ایرا بھی نزدیک بیٹھ کر بڑے انہماک سے ان الفاظ کو پڑھنے میں کوشاں ہوئی۔ ہمارے گرد جارجین لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ "کچھ قرآن کی سی آیت معلوم ہوتی ہے" ایرا نے کہا۔ بڑے تعجب کی بات تھی۔ کیتھڈرل میں عین قربان گاہ کے نیچے ابن ملک شاہ کا مزار۔ میں نے پوری عبارت کاغذ پر نقل کی۔ ساتویں سے دسویں صدی عیسوی تک جارجیا خلافتِ عباسیہ اور اس کے بعد سے سلاطینِ سلاجقہ کا ایک صوبہ تھا۔

ملک شاہ سلجوقی کا کوئی بیٹا شاید جارجیا کا گورنر رہا ہو اور وفات کے بعد اسے یہاں دفن کیا گیا ہو۔ مگر اسے گرجا میں کیوں دفن کیا گیا؟ ممکن ہے اس کی ماں گرجستانی عیسائی شہزادی رہی ہو یا ممکن ہے

اہل گرجستان نے بطور عزت و تکریم مسلمان سلجوقی حاکم کو اس گرجا میں جہاں انکے بادشاہ دفن ہوتے تھے۔ سپرد خاک کیا ہو۔ بد قسمتی سے کتبے میں مرحوم کا نام بالکل مٹ چکا تھا۔ بعد میں لینن گراڈ جا کر میں نے ایک عراقی شاعر سے اس شکستہ عبارت کو DECIPHER کروایا۔

"۔۔۔ ابن ملک شاہ ۔۔۔۔ ہمارے سلطان کی تاریخ میں ۔۔۔ واسطے اللہ کے جو ہماری تکالیف اور مصائب کا خاتمہ کرنے کے لیے بطور امداد ہمیں بیماری اور موت بھیجتا ہے ۔۔۔ آخر میں ہم ۔۔۔ گرمی سے بچانے کے لیے سایہ ۔۔۔ ایک اور جگہ پر ــــ ایک اور مکان ۔۔۔ ابدی آرام ۔۔۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ مرحوم کا بیٹا ہمارا بادشاہ ہو گا ــ"

نہ معلوم اس بیچارے شہزادے پر کیا گزری تھی کس طرح مرا۔ اور اس کی عیسائی جارجین رعایا نے وعدہ بھی کیا کہ اسکا بیٹا ان کا دوسرا حاکم ہو گا۔ اس ایک دھندلے لوحِ مزار کی یہ ربط عبارت کے پیچھے جانے کیسی کہانی کتنا بڑا المیہ کون سا تاریخی موڑ چھپا ہو گا۔ مجھ سے میرے روسی دوستوں نے کہا میں اس عبارت کو جارجین اکیڈمی آف سائنسز کے پاس بھیجوں تاکہ وہ اس منفرد مزار کے بارے میں تحقیق کریں۔ یہ سب کرنے کا پھر وقت نہ ملا۔

ابن ملک شاہ کی قبر پر سے لوگ گزرتے رہے اور اونچی پرنجی شمعدانوں میں موم بتیاں جھلملایا کیں ہم لوگ اس کیتھڈرل سے نکل کر پھر جدید طبلسی کی طرف روانہ ہوئے جس کی سڑکوں پر موٹروں کی فراوانی اور ٹریفک سے

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک مغربی سرمایہ دار عیش پرست شہر ہے۔ بے شمار
موٹریں اب سوویت یونین میں عموماً نظر آتی ہیں مگر طبلسی سب شہروں سے
بازی لے گیا۔

شہر میں دریا کے کنارے ٹیلے پر ایک ، ور ساتویں صدی عیسوی کا قلعہ
بند گرجا۔ (یہ سارے قلعہ بند گرجا مسلمانوں سے بچانے کے لیے بنائے گئے
تھے) ہم لوگ ادھر ادھر گھومتے اندر داخل ہوئے تو ایک غیر متوقع منظر
دکھلائی پڑا۔ گرجا کا گول وسطی ہال ایک تجرباتی تھیٹر میں تبدیل کر دیا گیا
تھا۔ آرک لائٹس کے نیچے گول اسٹیج پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک
ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف تھے۔ ڈرامہ نگار وجے تندولکر بڑے انہماک
سے ناٹک دیکھنے میں مشغول ہوئے۔ بنگلہ دیشی وفد کے لیڈر ڈاکٹر مظہر الاسلام
اور ہمارے ڈاکٹر سنگھ میرے برابر کی کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ میں
بھی کھیل دیکھنے میں منہمک تھی اچانک خراٹوں کی آواز نے چونکا دیا۔
دونوں حضرات بڑے اطمینان سے محو خواب اور زور زور سے خراٹے لے
رہے تھے میں نے ان کو جگانے کی کوشش کی۔ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ چند
منٹ بعد پھر آنا غفیل۔

جارجین نامی تماشاگر، مصور اور موسیقار ہیں۔ ان کی فلم انڈسٹری بہت
ترقی یافتہ ہے۔ شام کو ہم لوگ ایک بہت ہی عظیم الشان سات منزلہ کانسرٹ
ہال میں گئے جہاں ایک ہر دلعزیز و معروف پوپ گروپ تازہ ترین
اسٹیج کرافٹ کے ساتھ اپنے کمالات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ "جدید موسیقی"

کی کوئی سیاسی سرحدیں نہیں ہیں۔ ہم لوگ کونسرٹ سننے میں محو تھے۔
خر۔ خر۔ خر۔ ڈاکٹر منظہر الاسلام اور ڈاکٹر سنگھ متفقہ شگاف خراٹے
لے رہے تھے۔

طبلسی سے دور ایک خوبصورت پہاڑی پر ایک اور پرانا قلعہ، گرجا اور قبرستان
جس میں جارجین مشاہیر دفن ہوتے ہیں۔ سیاحوں کا جم غفیر۔ قبریں ایک سے
ایک خوبصورت ان پر مرمریں مجسمے اور ترو تازہ گلدستے۔ ایک مشہور جارجین
ایکٹر کی قبر اور پہاڑی پر ایک قدیم گرجا کا کھنڈر۔ میلوں دور تک سرسبز گھاس
بل کھاتے پہاڑی راستے جن پر سے موٹروں کی قطاریں گزر رہی ہیں پہاڑی
پر نوجوانوں کا ہجوم جو لبناشس گانے گا رہے ہیں۔ گرجا کے اندر ریکارڈیڈ
موسیقی متواتر بج رہی ہے وادی میں دو چوڑی ندیاں بہہ رہی ہیں حدِ نظر
تک پانی اور سبزہ۔

ایک سرسبز پہاڑی گاؤں۔ شفاف سڑکوں پر پائن کے چوبی پھول پٹ
پٹ گر رہے ہیں ایک شیڈ میں دو مزدور۔ لنچ اسپلے انڈے۔ نان۔ پنیر میں
مصروف۔ ایک عمارت سے دو بچے گلدستے لیے دوڑتے دوڑتے نیچے آتے
ہیں۔ اونچی گھاس سے ڈھکے ایک ٹیلے کے اندر غار نما خالی مکان، دروازے
پر ترو تازہ خود رو پھولوں کے سیلاب۔ ایک ہزار سال قبل عرب حملہ آوروں
سے بچنے کے لیے کسان یہ زیر زمین مکان بنا کر ان میں رہتے تھے۔ ایک
جارجین بتاتا ہے۔

اور پرانا جارجیا۔ بادشاہ۔ بانکے شہزادے۔ ڈیوک جابر جاگیردار۔ ان کے

دیہاتی محل۔ ایک بڑے زمیندار کے چوبی مکان میں جو اب میوزیم ہے
تخت پر ایرانی قالین بچھا ہے۔ صوفے پر ایرانی وضع کی قبائیں۔
عصرِ حاضر۔ طبلسی کے آرٹسٹوں کے کلب میں ایک نامور مصور کا وَن
مین شو۔ بیحد موڈرن تصاویر۔ مصور ساری دنیا کے آرٹسٹوں کی طرح ایک
کینوس کے پیچھے چپ چاپ کھڑا ہے۔
طبلسی سے روانگی کی صبح اہلِ بنگلہ دیش ایک لاؤنج میں فرد کش تھے۔
باہر ایک مرمریں جارجین گنبد نما فوارے کی اونچی پھواریں دھوپ میں جگمگا
رہی تھیں ہوٹل آئیویرآ (کہ ائیویرآ جارجیا کا قدیم نام ہے) کے سامنے کوہستان
اور وادیوں میں حد نظر تک طبلسی پھیلا ہوا تھا۔ بہت تیز ہوا چل رہی
تھی۔ نیچے دریائے کرا کا پانی جو جانے کتنے ہزاروں لاکھوں برس سے،
طوفانِ نوحؑ کے بعد سے اسی تندروی سے بہہ رہا تھا اس کی رفتار
میں رتی بھر کمی نہیں آئی تھی۔ لمبے لبادے پہنے سیاہ چشم لڑکیاں اور بانکے
جارجین ہوٹل میں ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ اور ان سب کے اجداد نے
کم خونریزیوں میں حصہ نہیں لیا تھا نہ کم ستائے گئے تھے۔ انسان بڑا سخت
جان ہے ان ہی خانقاہوں میں سے کسی ایک میں جو دور پہاڑوں میں پوشیدہ
تھیں، جوزف اسٹالین پادری بننے کے لیے داخل ہوا تھا اور مذہبی طالب علم
کا سیاہ لبادہ پہنے اسی سامنے والے دریائے کرا کے کسی پل پر سے گزرتا ہوگا۔
چلتے وقت کوہ سولولاکی پر پھر بادل گھر آئے۔ طلسماتی طبلسی دھند
میں کھو گیا۔

بابِ یار

کیو - ہیروسٹی - ایرپورٹ پر اسٹیپن نیلوائیکو، یوکرینی ہندی داں مترجم ادیب استقبال کے لیے موجود تھا، وہ چار برس کا تھا جب ناتسیوں نے اسی شہر پر قبضہ کیا۔ اسٹیپن کو بابِ یار بھی یاد ہے جہاں ناتسیوں نے اسی ہزار یوکرینیوں کو جس میں بیشتر یہودی تھے قطار میں کھڑا کر مشین گنوں سے بھون ڈالا تھا۔ شہر سے باہر یادگارِ شہدا کی پرشکوہ عمارت اس میدان میں استادہ ہے جہاں ایک محاذ پر چالیس ہزار روسی جرمن حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ باہر گلیار درختوں کے نیچے وہ ٹینک کھڑے ہیں جو اس محاذ پر استعمال کیے گئے۔ یوکرینی بچے ان پر چڑھ کر کود پھاند رہے تھے۔ انکے دادا دادیاں اسی جگہ کٹ کٹ کر مرے تھے۔ وہ میدانِ جنگ اب ایک

خوبصورت پارک ہے جرمنوں نے کیو کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لینن گراڈ کی طرح اسے بھی اسی نفاست سے دوبارہ تعمیر کر لیا گیا۔ کیو یاد کیجیے گا وہی شہر ہے جب آرچ ڈیوک ولادی میر (۹۸۰ء ۔ ۱۰۱۵ء) نے ڈر کے مارے مسلمان یہودی ہونے کے بجائے عیسائی ہو کر مسیحی ملک و قوم روسیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ کیو ولادی میر کا شہر ہے ۔ ان گنت طلائی گنبدوں والے عالیشان گرجا۔ محلات۔ باغ ۔ دریائے ڈنیپر کے کنارے اسکا بڑا مجسمہ استادہ ہے ۔ اسی جگہ ولادی میر نے خود دریا میں ڈبکی لگا کر بپتسمہ حاصل کیا اور اپنی رعایا کو ڈبکیاں لگوا کر عیسائی کیا۔

قدم قدم پر ولادی میر۔ ڈاکٹر سنگھ نے مجھ سے چپکے سے پوچھا " یہ بنڈی میر کون تھا جسکا یہ لوگ ہر وقت ذکر کرتے ہیں ؟"

ولادی میر اور اس کے جانشینوں نے وہ سو گرجا کیو میں بنوائے زوال بازنطیم کے بعد کیو تیسرا روم کہلایا۔

بارہویں صدی کی ایک خانقاہ ——— اور اس کے نیچے زیر زمین ایک اور راہب خانہ ——— گیلریوں کی بھول بھلیاں۔ زمین دوز حجرے اور انڈر گراونڈ لامتناہی گیلریوں کے اندر دو رویہ بڑے بڑے طاقچوں میں کئی محفوظ شدہ لاشیں۔ اس زمین دوز خانقاہ میں رہنے والے راہبوں اور پادریوں کے علاوہ کیو کے بادشاہوں ملکاؤں، اور شہزادوں اور شہزادیوں کی ممیاں اسی تزک و احتشام سے محفوظ کی گئی تھیں کہ فراعنہ مصر کی ارواح شرمادیں۔ یہ طویل سنگلاخ پر اسرار گیلریاں زمین سے کئی سو فیٹ نیچے اب ایر کنڈیشنڈ کر لی گئی ہیں۔

طاقچوں میں برقی روشنی۔ ساڑھے سات سو برس پرانی ممیاں سیاہ لبادوں میں ملبوس سب کے چہرے سیاہ کپڑے سے پوشیدہ شاہی خاندان کے افراد کے سروں پر تاج۔ شہزادیوں کے پیروں میں سبک جڑاؤ مخملیں جوتیاں خشک، سیاہ ہاتھ۔ طاقچے میں بارہ سیاہ پوش ممیاں ایک قطار میں لیٹی ہیں یہ بارہ راہب یونانی سگے بھائی تھے۔ جو بازنطیم سے یہاں آئے تھے۔ ان میں سے دو بہت چھوٹی لاشیں ہیں۔ کمسن مرے۔

گیلریوں میں سیاحوں کا ہجوم۔ برقی قمقموں کے نیچے مزید طاقچوں میں مقدس تصاویر فروزاں۔ جرمن اوپر کی خانقاہ تباہ کر کے چلے گئے اس انڈر گراؤنڈ کلیسائی ممی خانے کا انکو پتہ نہ چلا۔ دراصل زندہ یوکرینیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے فرصت نہ تھی۔ سات سو برس پرانی یوکرینی لاشوں کا کیا کرتے۔ بڑا لرزہ خیز حیرت انگیز مقام تھا۔ ہم لوگ زمین پر کھلی ہوا میں واپس آئے۔ احاطے میں پھلوں کے تازہ رس اور آئس کریم کی سوڈا مشینوں کے گرد بچوں کا ہجوم۔ روشن آسمان۔ زندگی کی چہل پہل اور تازگی۔ زرد پھولوں کا سیلاب۔

کیف سے باہر عظیم آبی شاہراہ پر دو اسٹیمر دور دور جا رہے تھے۔ ایک جہاز میں دلآویز موسیقی بج رہی تھی جو دور ساحل پر صاف سنائی دیتی تھی۔ شوقیہ مچھلی پکڑنے والوں کے سنسان طویل آبی پلیٹ فارم کے سرے پر ایک شخص ہیٹ لگائے جنگلے پر چپ چاپ جھکا پانی میں بنسی ڈالے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی تصویر لے لی۔ وہ بے نیازی سے مچھلی کا منتظر رہا۔

مشہورِ عالم "روسی بازنطینی" گرجا جرمن بمباروں نے تباہ کر دیے تھے انکو دوبارہ اُسی طرح تعمیر کر لیا گیا۔ ان کے اندر کے حسین مذہبی فریسکو جو برباد ہو گئے تھے انکو دوبارہ انتہائی دیدہ ریزی اور جانفشانی سے ملک کے بہترین مصوّروں نے دوبارہ تخلیق کیا ہے۔

شہر کے اندر ایک کیتھڈرل میں اتوار کی سروس۔ ہال میں حسبِ معمول معمر مرد عورتوں کا ہجوم۔ چند نوجوان بھی موجود ہیں جو ہماری طرح بطور ٹورسٹ آئے ہیں۔ لیکن کوائیر نوجوان لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ زرق برق لبادوں میں ملبوس پادری الطار کے نیچے کھڑے مذہبی رسوم ادا کر رہے ہیں۔ میں نے بھیڑ میں گھس کر پادریوں کی تصویریں اتارنی شروع کیں۔ ایک جواں سال اسقف نے مجھے دیکھ لیا فوراً ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ میں وہاں سے بھاگی۔

پھاٹک پر سیاہ پوش بوڑھی یوکرینی کسان عورتیں اندر جانے کی منتظر تھیں ایک طرف دبیے تندو کر اپنا کیمرہ سنبھالے کھڑے تھے۔ خشکی سے فرمایا۔ سوویٹ یونین آتے وقت میرا خیال تھا روسی مجھے اس قدر فیکٹریاں اور اجتماعی فارم دکھلا کر برین واش کریں گے کہ میں واپس جا کر کمیونسٹ ہو جاؤں گا۔ مگر ان لوگوں نے اتنے بے شمار چرچ دکھلائے ہیں کہ خدشہ ہے عیسائی نہ ہو جاؤں۔

یوکرینی بھی بیحد خلیق اور مہمان نواز لوگ ہیں۔ کیوّ سے روانگی کے وقت سارے یوکرینی دوست اور میزبان جذباتی ہو رہے تھے۔ ایسی نرم دل قوم

نے کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ تیز رفتار لکسزری ٹرین رات بھر یوکرین کی سیاہ مٹی پر چلا کی "استیپ" کہ سینکڑوں ہزاروں میل وسیع میدانوں میں سے گزر کر دوسرے دن ٹرین ماسکو وارد ہوئی۔

ایک بار پھر ریڈ اسکوائر۔ ہوٹل روسیہ۔ ہوٹل میں امریکن اور مغربی سیاحوں کا ہجوم پہلے سے زیادہ۔ لیکن سرخ چینی کوئی نہیں دکھلائی دیتا۔ ہوٹل روسیہ غالباً دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ چھ ہزار کمرے اور دس ہزار مہمانوں کے لیے گنجائش۔ پورے تیئیس ۲۳ میل کی طوالت کی گیلریاں۔ فوائیر میں ایک اور رنگارنگ گروہ بیرونی ممالک سے آکر اتر رہا تھا۔ یہ سب پشکن فیسٹول کے لیے وارد ہوئے تھے۔

اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر میں امینہ کے ہاں رومانیہ جانے کی تیاری میں مصروف تھی اتنے میں سوویٹ رائیٹرز یونین کی اردو داں سکریٹری مریم سلگانک نے نزول اجلال کیا۔ فرمایا۔ بخارسٹ پھر چلی جانا۔ پہلے پشکن فیسٹول میں شرکت کرلو۔ اور روسی فیڈریشن کی سیر کر آؤ۔

اسی فلور کے کیفے ٹیریا میں فیض صاحب حلقہ مریداں میں بیٹھے نظر آئے۔ موصوف ریگا سے سیدھے ماسکو آگئے تھے۔ میں نے پوچھا آپ بھی پشکن فیسٹول کے لیے چل رہے ہیں۔ فرمایا۔ چلے چلیں گے۔

دوسری شام کینیڈا، آسٹریلیا، فرانس، مشرقی یورپ، افریقہ اور عرب ممالک سے فیسٹول کے لیے آئے ہوئے ادیبوں کو بھر کر لکسزری ٹرین "سرخ تیر" لینن گراڈ کی طرف چلی۔ فیض صاحب مع حلقہ مریداں ایک بار

پر جا بیٹھے۔ ایمّا، میں اور چند دوسری خواتین سمآواروں کی طرف گئیں۔ اسٹیورڈ لڑکیوں نے چار اور چوکلیٹ کمروں میں پہنچائی۔ صبح کو ٹرین لینن گراڈ پہنچی۔ اسٹیشن پر شہر کا میونسپل انیتھم بجا۔ لینن گراڈ ایک مغرور اور خود پر نازاں شہر ہے اور اسکا یہ غرور قطعی جائز ہے۔

اسٹیشن سے ہوٹل لینن گراڈ چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ ہم لوگ پیدل اس کی طرف روانہ ہوئے۔

پچھلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں، ہنگری کی کلارا سوچی اسی فوائیر میں کھڑی ملی تھی۔ آج اسے مرے کئی سال ہو چکے تھے (بوڈاپسٹ سے ایک روز ایک سیاہ حاشیے والا کارڈ ہنگیرین زبان میں چھپا اس کے شوہر کی طرف سے میرے نام بمبئی آیا تھا) اور باقی سب جو پچھلی مرتبہ یہاں جمع ہوئے تھے اب کہاں کہاں ہونگے۔

مغربی یوروپ سے واپسی پر پیٹر اعظم ایک حبشی لڑکا اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسکا نام ابراہیم حنی بل (غالباً ہنبل) تھا اور وہ ابی سینیا کا مسلمان تھا۔ پیٹر اعظم نے اسے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا۔ پھر جنرل بنایا۔ ابراہیم عیسائی ہو گیا اور زار نے اس کی شادی ایک روسی رئیس زادی سے کر دی۔ الگزنڈر پشکن جو ۱۷۹۹ء میں ماسکو میں پیدا ہوا، ابراہیم حنبل کا پر نواسہ تھا۔

الگزنڈر پشکن کا پڑپوتا جو ایک ریٹائرڈ پبلشر ہے ہمارے ساتھ فیسٹول میں شرکت کر رہا ہے۔ خاموش طبیعت اور منکسر المزاج۔ اس کے بیس سالہ لڑکے، الگزنڈر پشکن کی شکل میں اپنے نامور جدِ امجد کی شباہت موجود ہے۔

GENES کا سفر۔

دوسری صبح ہم لوگ شہر سے باہر زار کے محل کی طرف روانہ ہوئے جس کے نزدیک وہ اسکول ہے جس میں پشکن نے پڑھا۔ کوچ میں سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھے ایک سر منڈے افغان نے باتیں شروع کیں (افغان نجانے سب کے سب سر کیوں منڈواتے ہیں) وہ کافی بڑا بور نکلا۔ گھنٹے بھر بعد میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ فیض صاحب پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھے تھے۔ مہاتما بدھ کی طرح۔ سگریٹ پی رہے تھے۔ آپ میری ساری فصیح و بلیغ فارسی راستے بھر سنتے آ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ دوسری سیٹ پر عراقی شاعر جسکا نہایت غیر شاعرانہ نام عبدالرزاق عبدالواحد تھا۔ اپنے روسی ترجمان ایگور سے کے ساتھ بے نقط کی عربی بولتا چلا آ رہا تھا۔

محل کے پشکن میوزیم میں پہنچ کر افغان میرے اور فیض صاحب کے ساتھ لگ گیا وہ روسی زبان کا ماہر تھا۔ اب اس نے خود کو ہمارا گائیڈ مقرر کر لیا۔

"بقول ماجد علی اَئیڈ یا ہو گیا اب باہر چلتے ہیں" میں نے کہا فیض صاحب اور میں کچھ دیر بعد زینے سے اتر کر نیچے آ گئے۔

افغان محل سے برآمد ہوا۔ لپکا ہوا آیا۔ ہم لوگ شاہی باغ کی طرف چلے وہ پیچھے پیچھے۔ فیض صاحب نے بزبان فارسی اس سے کہا ان کی والدہ بھی افغان تھیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ مگر اس نے بخشا نہیں۔ کوچ میں پھر ساتھ واپس آیا۔

شام کو میں نے دیکھا کہ عراقی شاعر عبدالرزاق عبدالواحد فیض صاحب

کے حلقۂ مریداں میں بیٹھا ہوا ہے۔

ارمتاژ۔ نچلے ہال میں دونوں طرف مرمریں مجسمے استادہ تھے۔ گائیڈ لڑکی نے کہا ——— "یہاں پہنچ کر روسی ملاحوں نے انقلاب کا آغاز کیا۔" ڈاکٹر سنگھ بڑی سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے بولے۔ "کمال ہے۔ روسی ملاحوں نے کتنی اچھی مورتیاں بنائیں۔" ڈاکٹر سنگھ کا جواب نہیں تھا۔

ارمتاژ میں چودہ ہزار نایاب تصاویر ہیں۔ بارہ ہزار مجسمے۔ پچیس لاکھ نوادر۔ چار سو کمروں میں سبھی یہ چیزیں صرف ایک ایک منٹ دیکھنے کے لیے پورے بارہ سال چاہئیں۔

شام کو فیض صاحب ماسکو واپس چلے گئے۔ ایک روز صبح ہم نے لینن گراڈ سے نکل کر بذریعہ کوچ شمال کا رخ کیا۔ شاہراہ پر دونوں طرف صنوبر کے کھلے جنگل۔ جھیلیں۔ زرد پھولوں کے تختے۔ خوبصورت قصبے۔ چوڑے دریا۔ طلائی اور زرد پھلی گنبدوں والے گرجا۔ ہم لوگ دریرہ لیٹویا اور لتھونیا کی طرف جا رہے تھے۔

پُشکن فیسٹول

کرسمس کارڈ کنٹری اسکوف کے راستے میں ہماری کوچیں ایک گاؤں میں رکیں۔ بارش ہو رہی تھی اور قومی پوشاک میں ملبوس بہت بڑا ہجوم ہمیں خیر مقدم کہنے کے لیے سبزے پر موجود تھا۔ لڑکے اکارڈین بجا رہے تھے۔ مردوں نے کواس سے بھرے مگ پیش کیے۔ بچے اور لڑکیاں لالے کے گلدستے لیے کھڑی تھیں۔ بارش تیز ہو گئی۔ ٹیلیویژن والوں نے فلمبندی شروع کی۔

بنگلہ دیشی وفد ماسکو سے ڈھاکہ واپس جا چکا تھا صرف اس کے قاید فیسٹول کے لیے ٹھہرا لیے گئے تھے۔ موصوف کو اپنی تصویریں کھنچوانے کا بیحد شوق تھا۔ برستی بارش میں وہ نہایت مستقل مزاجی سے ٹیلی ویژن کیمرے کے سامنے کھڑے رہے۔

کچھ دیر بعد ہم لوگ آگے روانہ ہوئے۔ بوڑھی عورتوں نے اپنی پوپلی

مسکراہٹ سے الوداع کیا۔ ایک بہت چھوٹا بچہ جس نے خود رو پھولوں کا ایک گچھا مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دیو کرتا رہا پھر بارشش کی دھند میں چھپ گیا۔

اسکوف میں قرون وسطیٰ کا بڑا کریملن (قلعہ) دریا کے کنارے استادہ ہے اور نقرئی گنبد والے گرجا۔ عبادت خانوں میں ہیرے جواہرات سے جڑی فینچم انجیلوں اور ہیرے جواہرات سے جڑے آئیکنوں کی ساہے یورپ میں روسس، جارجیا اور یوکرین کی طرح یہاں بھی افراط ہے۔ روسی چرچ دنیا کا امیر ترین کلیسا تھا۔

کریملن کے فصیل سے زار اپنے مجرموں کو نیچے پھنکوا کے ہلاک کروا دیتے تھے۔ ماسکو سے آئی ہوئی ایک فلم کمپنی فصیل کے نیچے شوٹنگ کر رہی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ کینیڈین شاعر اس کی بیوی اور میں اور مسٹر سنگھ ٹہلتے ہوئے قلعے کے تیرہویں صدی میں بنے گرجا کے اندر چلے گئے۔ ایک کمرے میں پادری نماز جنازہ پڑھانے میں مصروف تھا۔ اسی طرح کا کھلا منقش تابوت اور سوگوار مزدور میں نے پانچ سال قبل ماسکو سے باہر ایک گرجا میں دیکھے تھے۔ یہاں چند سیاح بھی موجود تھے۔ سوگوار رو رہے تھے۔

ایسٹونیا کی سرحد پر پچوری۔ ایک انتہائی خوبصورت، پرستانی میڈیول خانقاہ جس کے اندر چورانوے راہب موجود تھے۔ ان میں سب سے بوڑھے کی عمر ایک سو تین برس تھی اور سب سے کم عمر ایک چوبیس سالہ لڑکا تھا۔

خانقاہ کے پھاٹک کے نیچے سڑک پر سے ایک بوڑھا گزرا۔ روسی بلاوز، گھنی

سفید داڑھی۔ موٹے جوتے ہاتھ میں عصا۔ کمر سے بندھا پٹکا اور بنڈل۔ ٹالسٹائی کا ایک کردار۔ پرانا روس اس جگہ ایک پینٹنگ کی طرح موجود تھا۔

قصبہ میخائیلوسکو میں پشکن کی ماں کی زمینداری تھی جہاں شاعر زار کے حکم سے کچھ عرصہ جلاوطن رہا۔ یہ سارا علاقہ حسین ترین کرسمس کارڈ کنٹری ہے۔ پشکن کے مکان کے چاروں طرف پائن کے شاندار جنگل، ندیاں، جھیلیں باغات۔ باغ میں سے گزرتی ندیوں پر خوبصورت پُل۔ پشکن کا مکان اسی طرح سجا سجایا موجود ہے۔

پشکن فیسٹول کے آخری دن صنوبر کے ایک جنگل میں پچاس ہزار شمالی روسیوں کا مجمع جو ہاتھوں میں لالہ کے گچھے لیے جوق در جوق اس سبزہ زار کی طرف آرہے ہیں جہاں ایک طرف کتابوں کی دوکانیں لگی رہی ہیں۔ روسی بے تحاشا کتابیں خریدتے ہیں۔ کوچ کے ڈرائیوروں نے اپنے ڈیش بورڈ کے اوپر کتابیں رکھی ہوئی ہیں اور وہ آپ سے آٹو گراف لیتے ہیں۔ سوویٹ یونین میں ہر فرد و بشر کو غیر ملکی ادیبوں سے آٹو گراف لینے کا اس طرح جنون ہے جس طرح ہمارے ہاں فلم اسٹاروں کو گھیرا جاتا ہے۔ اس جنگل میں ہم لوگوں نے ہزاروں آٹو گراف بکس پر دستخط کر کے دیئے۔ پہلے پولیس کے سپاہیوں نے جو بندوبست پر متعین تھے آٹو گراف بکس۔ مجمع سے لے لے کر پہنچانی شروع کیں آخر میں وہ بھی تھک گئے اور ہجوم کی قطار کم ہونے میں نہ آئی اس میں ہر عمر کے مرد عورتیں اور نوجوان لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔

بہت وسیع ڈائیس پر مندوبین کی تقاریر شروع ہوئیں۔ پچاس ہزار کا مجمع گھاس پر بہ نہایت عقیدت سے بیٹھا سن رہا تھا۔ میں نے اپنی فی البدیہ تقریر بزبان انگریزی میں علامہ اقبال کو بہت quote کیا جو ایسے موقع پر بہت کام آتے ہیں۔ ایرا نے روسی میں ترجمہ کیا۔ بنگلہ دیشی قاید نے ٹیگور سے شروع کر کے ٹیگور پر ختم کیا۔

پشکن گوری (پشکن کی پہاڑی) کے جدید ترین وضع کے ہوٹل میں رات کے وقت ایرا کے کمرے میں فیسٹول کے منتظم روسی، ایک اور روسی دوست اور اس کی تاتاری بیوی کا سے سیاسی بحث چھڑ گئی۔ رات کے دو بج گئے۔ بحث ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ تین بج گئے۔ میں نے دوستوں سے کہا میری فلور تک ساتھ چلے چلیں۔ ایرا کو شب بخیر کہہ کر ہم چوتھی منزل پر آئے۔ اپنے دروازے پر پہنچ کر کنجی لگائی۔ دروازہ کس طرح نہ کھلا۔ تینوں روسیوں نے کوشش کی۔ دروازہ نہ کھلا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ پشکن کی پہاڑی پر مرغ نے اذان دی۔ دروازہ تب بھی نہ کھلا۔ اتنے میں ایک بوڑھی ملازمہ آنکھیں ملتی ہوئی آئی۔ روسی دوست سے کنجی لے کر دیکھی اور بولی۔ یہ غلط کنجی اور غلط فلور ہے۔

صبح کو بریکفاسٹ کے لیے نیچے جاتے ہوئے کینیڈین شاعر کی لڑکی زینے پر ملی اس نے اپنے جھجے والی ہیٹ پر زرد پھول اڑس رکھے تھے اور وہ یونان کی سنتھیا معلوم ہو رہی تھی۔

بریکفاسٹ کے بعد ہم لوگ پیدل اس گرجا کی طرف چلے جس میں

پشکن دفن ہیں راستے میں مرغ بانگ دے رہے تھے اور کاٹجوں سے دھواں نکل رہا تھا۔

گرجا کے ہال میں شمعیں روشن تھیں۔ سوویٹ کوائر نے وہ حمدیں گائیں جو ۱۸۳۷ء میں پشکن کی تدفین کے روز اسی جگہ گائی گئی تھیں۔

پشکن گوری سے واپسی پر میلوں دور تک نرگس کے پھولوں کے تختے دریاؤں کی طرح لہریں مارتے نظر آرہے تھے۔ جنگلوں میں پھولوں کی افراط تھی۔ ایک دیہاتی قبرستان کے پھاٹک پر کوچیں رکیں۔ یہاں پشکن کی ایک محبوبہ اینا کرین کا مزار تھا۔ گورستان پائین کے جھنڈ میں پوشیدہ تھا۔ نزدیک ندی بہہ رہی تھی۔ اس پار ایسے چوبی مکان جو روسی پریوں کی کہانیوں کی تصاویر میں نظر آتے ہیں۔ قبرستان میں ہر لوحِ مزار پر متوفی کی تصویر اور تازہ گلدستے غالباً CULT OF THE DEAD یہ

ان کے بازنطینی ماضی کی یادگار ہے۔ ایک بوڑھی عورت ایک قبر کے پاس خاموش کھڑی تھی۔ سنگِ مزار پر ایک نوجوان کی تصویر۔ شاید اسکا بیٹا تھا۔

"یہاں سوویٹ یونین میں ہر جگہ ہر قبر پر تازہ گلدستے شاید گورنمنٹ صبح صبح ہر جگہ رکھوا دیتی ہے" مسٹر سنگھ نے ایک اور نادر خیال کا اظہار کیا۔

نووگراد۔ روس کا قدیم ترین پایہ تخت اور اسکوف کی طرح پرانی خالص روسی تہذیب کا گہوارہ۔ اسکوف کی طرح ایک اور پرستانی شہر۔ چوڑا۔ دریا۔ قدیم قلعہ۔ نقرئی گنبدوں والے کلیسا۔ میوزیم میں روس کے نادر ترین ایکنول مذہبی فریسکوز اور مذہبی تصاویر کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔

قرون وسطیٰ کے ایک مرچنٹ پرنس کا دو منزلہ گھر، چوبی زینہ۔ اوپر وسیع کمرے۔ بھدا فرنیچر۔ سنگلاخ دیواریں۔ آئیکن۔ موٹے لبادے۔ زینے پر ایک پنچ پڑی تھی۔ صحن میں مرغیاں چرچگ رہی تھیں اور دھوپ میں عبدالرزاق اپنے روسی ترجمان نوعمر عربی داں ایگور سے باتوں میں مصروف تھا۔ ایگور اس مکان کی تہذیبی کائینات کا وارث تھا۔

شہر سے باہر ایک ٹیلے پر بہت ہی قدیم تاریخی قبرستان نیچے دریا۔ قرون وسطیٰ میں سویڈن کی فوجیں اس جگہ سے شہر پر حملہ آور ہوتی تھیں۔ یہاں شمال میں سویڈن۔ مغرب میں پولینڈ۔ جنوب مغرب میں ترکی۔ پرانے روس کے تین روایتی دشمن تھے۔

قبرستان سے ملحق ایک بہت ہی پرانا شکستہ گرجا۔ اس کے گرد تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں نے اس کی شکستہ کھڑکی سے اندر جھانکا جہاں ایک ہزار سال کا ملبہ موجود تھا۔ اچانک بورانخان نظر آگیا دوسری کھڑکی میں سے جھانک کر اس نے دفعتاً غیر متوقع اردو میں کہا۔

"بہت تیز ہوا چل رہی ہے" اور غائب ہوگیا۔

واپس اسکوف۔ ہوٹل سے کچھ فاصلے پر روپن ایر مال روم میں رقص ہو رہا تھا۔ لوگ باگ رات کے اُجالے میں سڑکوں پر ٹہلتے پھر رہے تھے۔ شمال کی دو سپید راتوں کا زمانہ ختم ملتہیں ہوا۔

ملیشیا سے آیا ہوا ایک عجیب سا آدمی (یعنی دنرا PECULIAR) سیاہ ٹوپی، پتلون پر ایپرن۔ اپنے روسی مترجم کے ساتھ ایک درخت کے

پیچھے کھڑا بڑے انہماک سے ناچ ملاحظہ کر رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سنگھ سے کہا یہ آدمی بہت عجیب سا لگتا ہے۔ کہنے لگے۔ یہ بھی اپنے دیس کا جہا کیرتی ہلایلک ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب بعض دفعہ بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے تھے۔

اسکوف شمالی روسی ریلوے کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ شہر کے مختلف اداروں نے مختلف مندوبین کو الگ الگ مدعو کیا تھا۔ ریلوے کلب نے مجھے، ڈاکٹر سنگھ اور بنگلہ دیشی نمائندے کو دعوت دی۔ چلنے سے پہلے میں نے ڈاکٹر سنگھ کو پشکن پر BRIEF کیا۔ اور کہا بس آپ ہندی ادب کی جنرل تصویر کھینچ کر یہ کہتے جائیے گا کہ پشکن اور اس کے آدرشوں نے بھی ہندی ادب کو بہت متاثر کیا ہے۔

"ٹھیک ہے"

کلب کا ہال ریلوے مزدور مرد عورتوں سے پُر تھا جو ہندوستانی ادب پر تقریر سننے کے لیے بیحد مشتاق نظر آتے تھے۔ بنگلہ دیشی ادیب نے "ٹیگور اور پشکن" "ٹیگور اور پشکن ——" بار بار کہا۔ جس کا ترجمہ ان کے بنگالی ترجمان بورس نے کیا اور مجھے "غالب اور گیٹے والا" مشہور لطیفہ یاد آیا۔

تقاریر کے بعد شمالی روسی ریلوے کے افسر اعلیٰ ہم تینوں کو اوپر کھانا کھانے کے لیے لے گئے۔ دوسری منزل پر ایک کمرے میں ضیافت کی میز چنی ہوئی تھی۔ ایک چار جین شاعر اور روسی میزبانوں نے ٹوسٹ پینے شروع کیے جو چار گھنٹے تک چلا کیے۔ ڈاکٹر سنگھ بھلے آدمی تھے۔ شراب چھوتے نہیں تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اب چار کا دور چلا ایک روسی ریلوے افسر چائے کا سامان اٹھا اٹھا کر کمرے میں لا رہا تھا اتفاقاً میں نے جا کر اس کی

مد شروع کی اور سب کو چاد سرد کرنے میں مشغول ہوگئی۔ روسی ریلوے
کے افسر اعلیٰ نے جو ایک جنرل تھے فوراً ایک بیج مجھے دیا اور کہا آج سے تم ہماری
یونین کی ممبر ہو۔ ہم لوگ چار بجے اس میز پر بیٹھے تھے نو بجے رات کے کھانا شروع
ہوا۔ باہر سورج ابھی چمک رہا تھا۔ روسی جنرل بہت شفیق اور سوئیٹ بزرگ
تھا۔ اس نے دوبارہ کہا تم ہماری یونین کے ممبر ہو۔ بہترین روسی چاکلیٹ کا
عظیم الجثہ ڈبہ مجھے تھما کر بہت جذبے سے دہرایا۔ "تم ہماری یونین کی ممبر
ہو——" ہم لوگ کوچ میں آکر بیٹھے۔ ایک روسی شرمایا ہوا سا ایک کونے میں
کھڑا تھا۔ اس نے ایرا سے کچھ کہا اور مجھے ایک قلم پیش کیا" آپ ہمارے ریلوے
ورکرز یونین کی ممبر ہیں"۔ چونکہ میں نے بطور مہمان علیحدہ بیٹھے رہنے کے بجائے
ان لوگوں کے ساتھ مل کر چائے بنائی اور سرو کی تھی۔ اتنی سی بات سے یہ لوگ
اسقدر متاثر ہوئے تھے۔

اسکوت کے تھیٹر ہال میں شمالی روس کے ناچ۔ آخری رات ہوٹل میں الوداعی
ضیافت۔ ٹوسٹ پہ ٹوسٹ پیئے جا رہے تھے۔ حسبِ دستور میز پر مکے مار مار کر
روسی جن کی داد دیتے تھے بیحد شور مچ رہا تھا۔ میں نے کھڑے ہوکر WATER
MINERAL پر ہندوستان کی طرف سے جامِ صحت تجویز کیا۔ تالیوں کے
شور سے چھت اڑ گئی۔ پورے مجمع میں میرے اور ڈاکٹر سنگھ اور کینیڈین
شاعر اور ان کی بیوی کے علاوہ انگلش اسپیکنگ شخص اور کوئی نہ تھا۔ فیسٹول
کے خوش مزاج منتظم اعلیٰ کے لیے کینیڈین شاعر ان کی بیوی اور میں نے
"فور ہی از اے جولی گڈ فیلو" گایا۔ اس وقت اس سلاد مجمع میں اچانک ہم تینوں

اینگلو سیکسن اور برٹش کولونیل روایت کے نمائندے بن گئے۔ جگ سا پزل کے مختلف ٹکڑے۔

کالینن شہر۔ والگا کے کنارے۔ بارش ہو رہی ہے۔ اس روسی سیاح کا شہر ہے جو سولہویں صدی میں ہندوستان آیا تھا۔ اسکا مجسمہ دریا کے کنارے بارش میں بھیگ رہا ہے۔

ایک اور دریا کے کنارے ایک خوابیدہ پکچر یسک شہر تورزوک۔ اس میں ایک اور پشکن میوزیم۔ ماسکو جاتے ہوئے پشکن اس مکان میں قیام کر کے صاحبِ خانہ کی لڑکی سے فلرٹ کرتا تھا۔ ایک کمرے میں وہ کنگھی تک موجود ہے جس سے پشکن کی گاڑی کے گھوڑے کی ایال سنواری جاتی تھی۔ یہاں میر صاحب و غالب کے مکان تک مرٹ گئے۔

شمالی روس کا علاقہ ایک سلاد نورڈک پرستان ہے۔ کہ شح کے ذریعے ایک ہزار میل کی سیاحت کر کے واپس ماسکو۔ کریملن کے ہال آف کانگریس میں بیلے کے پروگرام۔ کٹھ پتلیوں کے تھیٹر۔ ریڈیو اسٹیشن سینما۔ ماسکو کی مانوس معمولات واپس ہوٹل روسیہ میں دیسے ہندو مکر ر جو پشکن فیسٹول کے لیے ہتیس گئے تھے) مجھ سے کہتے ہیں ایک طالب علم تاشقند سے آیا ہے۔ آپ کو پوچھتا تھا۔ شام کو اس کا فون آیا سلیس با محاورہ اردو بول رہا تھا۔ در میں شہرت عظیموق ہوں۔ آپ کے ناولوں پر ـــــ"

"پی۔ ایچ۔ ڈی ـــــ ؟" میں نے اس کی بات پوری کی۔ "میاں کوئی اور معقول کام کرو" میں نے اسے بھی سمجھایا۔

شام کو وہ ازبک بچہ ملنے آیا۔ بڑی مشکل سے اس نے میری کتابیں لاہور سے حاصل کی تھیں سفینۂ غم دل کہیں سے مستعار لے کر ایک ایک صفحہ کی فوٹو کاپی بنائی تھی اور نہایت انہماک سے اس کے مطالعے میں مصروف تھا۔ کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا مگر نہایت صاف اردو بولتا تھا۔

رائیٹرز یونین کلب میں ٹی۔وی کیمرہ والوں کی یلغار سے نکل کر میں طعام خانے میں گئی جہاں ایرا آ منتظر تھی۔ ایرا جسے اپنی صورت شکل کے لحاظ سے ایک بیلرینا ہونا چاہیئے تھا ایک انتہائی پر خلوص لڑکی تھی اور شدید حسِ مزاح کی مالک۔ ہال میں الوداعی پلنچ شروع ہونے والا تھا۔ اپنی اپنی پلیٹیں لے کر ہم لوگ بالکنی میں جا بیٹھے جہاں سے فری میسن حضرات نیچے ادا کی جانے والی پراسرار رسوم دیکھتے ہوں گے۔ نیچے ایک کونے میں عبدالرزاق عالمِ سرخوشی میں ایگورؔ سے مصروف گفتگو تھا۔ یہ ذہین اور بشاش ترجمان لوگ اتنے دن ساتھ رہ کر ہمزاد سے بن جاتے ہیں۔ ادا ایراؔ۔ ایگورؔ۔ بورسؔ۔

باہر بارش میں درختوں کے زرد پھول گر رہے تھے۔ سہانی ہوا چل رہی تھی ایک شرابی ایک درخت کے تنے سے لگا کھڑا تھا۔ عبدالرزاق اور ایگور باہر نکلے اور مارچ کرتے کسی طرف کو چلے گئے۔ نہ دیک کی میوزک کنزرویٹوری کا پھاٹک کھلا دو نو عمر لڑکے وائلن کا کیس سنبھالے باہر نکلے بارش ہوتی رہی۔

"فود گراڈ میوزیم میں میں تمہارے قدیم ترین اجداد کی باقیات اور ان کے گاؤں اور جھونپڑوں کے موڈل دیکھ کر آئی ہوں۔" میں نے شام کو ننٹا شا ادہ سلاوا

سے کہا۔ وہ میرے کمرے میں دریچے کے پاس بیٹھے تھے۔ نیچے ماسکو دریا بہہ رہا تھا۔ دور دور تک ہزاروں میل کی وسعت پر پائین رے۔ جنگل سایئں سایئں کر رہے تھے۔ جیولوجیکل وقت کے مقابلے میں انسان تہذیب کا اتنا مختصر وقفہ اور انسان کی اتنی زبردست ترقی ——— اور انسان کی یہ حیرت انگیز ہمت اور سخت کوشی۔ ناقابلِ یقین ہوتی اگر ہم خود انسان نہ ہوتے۔

کینڈین شاعر اس کی بیوی اور بیٹی، عراقی شاعر عبدالرزاق، وہ داغستانی ادیب جو یوروپین فیڈریشن کی شاہراہوں پر کوٹ میں بیٹھے بیٹھے جب بھی مجھے یا عبدالرزاق کو دیکھتا الحمد شریف پڑھنے لگتا شاید یہ جتانے کے لئے اتنی عربی تو اسے بھی آتی ہے، ہم لوگوں نے اُس کا نام "داغستانی مُلّا کا بیٹا" رکھ دیا تھا، ترک شاعر، ایتھوپین طالبعلم، بورا افغان، امریکہ پلیٹ روسی شاعرہ تاجکستانی شاعرہ گلرحنار صفیوا ——— جگ ساپزل کے مختلف ٹکڑے۔ ان سے تصویر بنتی ہے۔

روانگی کی صبح ہوٹل کے فوائر میں شہرت عظیموف تحائف اور لالہ کا گچھا سنبھالے۔ اور ایئر پورٹ پر ایرا کی آخری جھلک سموری ٹوپی پہنے لالہ کا گچھا سنبھالے۔ اللہ حافظ۔

— اچھا لینن حافظ۔

خضر سوچتا ہے

ہمالہ کے چشمے اُبلتے ہیں کب تک۔ خضرؔ سوچتا ہے۔

تو جیولوجسٹ نے جواب دیا ڈیڑھ ملین برس پہلے آکس ۱ ایج تھی۔ ہمالہ کے پہاڑ رفتہ رفتہ اتنے اُونچے ہوئے کہ ان پر برف پڑنے لگی اور گیارہ ہزار سال سے یہ برف بتدریج گھٹ رہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ دکن پلیٹو اور سائبریا ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مگر درمیان میں سمندر ویلن کی طرح حائل تھا۔ نہ جانے یہ جیولوجسٹ لوگ یہ سب کس طرح معلوم کر لیتے ہیں۔

برف گھٹی اور انسان کی عقل بڑھی تو اس نے سوچنا شروع کیا۔ ابر کیا چیز ہے۔ بھاگیا ہے۔ برف اور سناٹا اور پانی اور بلندی اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو برف کی چوٹی پر رہتا ہے۔ صحرائی انبیاد کو صحرائی بگولوں میں خدا

کی آواز سنائی دیتی تھی، تو امرناتھ کی یاترا آج تک جاری ہے۔ اور "ستی پاروتی" گویا پانی کے روپ میں ظاہر ہوئی کہ یہ وادی پہلے پانی سے لبریز جھیل تھی۔ ستی سر اور پھر کیشپ منی نے دکھن سے سفر شروع کیا۔ جالن دھارا (آج کا جالندھر) پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ سارا آتر سنسان پڑا ہے۔ وہاں ایک راکھشک جل اوبھو نے آفت جوت رکھی تھی۔ گلیشیر پگھل رہے تھے ہر طرف پانی ہی پانی۔ اور خاموشی۔ اور اس میں پانی کی گرج اور ٹوٹتے پھسلتے پہاڑوں اور برفانی چٹانوں کی ہیبت ناک آواز۔ گویا جل اوبھو کی تباہ کاریاں جل اوبھو اور اس کے چیلے چانٹے دیو اودھم مچا کر ستی سر جھیل میں چھپ جاتے تھے (شاید وہ برفانی نیم انسان یتی رہے ہوں) تب کشپ منی نے تپسیا شروع کی اور وشنو نے جنگلی سور کا اوتار لے کر اپنی دم کے ایک جھٹکے سے پہاڑ کاٹ ڈالا ستی سر کا پانی بہہ گیا اور دیو ہلاک۔ وشنو نے ورہ اوتار لیا تھا جسے انگریزی میں (BOAR) کہتے ہیں۔ قدیم ترین انڈویورپین زبان کی مختلف شاخوں کی مماثلت وشنو جہاں بشکل ورہ ظاہر ہوئے وہ جگہ رفتہ رفتہ بارہ مولا کہلانے لگی۔ ورہ سے بارہ۔ ستی سر کا پانی بہا اور ایک حسین وادی اور پہاڑیاں نمودار ہوئیں۔ ماہرین ارضیات نے کہا کہ جہلم پہلے بانہال کے قریب سے نکلتا تھا۔ جب پہاڑ اور اونچے ہوئے تو جہلم کا رخ بدل گیا اور بارہ مولا کے پاس ایک آبشار اور جھیل بن گئی (بہت ممکن ہے کہ کشمیر کے قدیم باشندوں کے نسلی حافظے میں یہ واقعہ موجود ہو جس کی بناء پر انھوں نے وشنو کے ورہ اوتار لے کر پہاڑ کاٹنے اور ستی سر جھیل کا پانی بہہ نکلنے کی روایت تیار کی)

کشپ مُنی کا کشپ میر۔ بھائی جل اد بھو گویا جہاں پکڑے گئے تھے وہ جگہ اب سرینگر ہے ۔ ہو سکتا ہے یہ "دیو" اور "راکھشش" برفانی آدمی دراسی اسکیمو کی قسم کے رہے ہوں جن کو جنوب سے آکر زیادہ متمدن آریوں نے زیر کیا۔ کشپ منی ان آریوں کے کلچر ہیرو رہے ہوں گے۔ عالمی اساطیر میں SAINT GEORGE THE DRAGON KILLER کی طرح کی متعدد کہانیاں موجود ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے ان قدیم پانیوں کی ایک یادگار جھیل وُلر ایک سو پچیس مربع میل کے رقبے پر پھیلی ہے۔ یہ اساطیر نیلہ مت پران میں لکھی گئیں۔ جو کشمیر کی قدیم ترین کتاب ہے۔ جو نیلہ منی نے لکھی۔

باغِ سلیمان

نیلہ مت پُران پڑھنے والے پنڈتوں کی کلمہ گو اولاد نے سینکڑوں برس بعد اپنی اساطیر تیار کیں۔ یوں کہ حضرت سلیمان بھی کشمیر آئے تھے۔ بطور ٹورسٹ محمد امین پنڈت "مختصر تاریخ کشمیر" میں راوی ہیں:۔

"کوہ چیٹ لارک" پر قیام کیا جس کی وجہ سے یہ پہاڑی کوہ سلیمان کہلائی۔ ایک ہفتہ تک سیر کی۔ فارغ ہو کر واپس تشریف لے گئے۔ ترکستان کے شہزادے ساتھ لائے تھے۔ ہشک کنشک اور رشک۔ حضرت سلیمان نے کشمیر ان کو جاگیر میں دیا اور ملک کا نام باغِ سلیمان رکھا۔"

کشمیر جیسے پرستان کا نام یقیناً "باغِ سلیمان" ہونا چاہیئے۔ لیکن بادشاہ سلیمانؑ بن داؤدؑ کا دورِ حکومت ۹۷۲ ق م سے ۹۳۲ ق۔م اور ترکستانی

کنشک تقریباً ایک ہزار سال بعد ۱۲۵ء میں کشمیر کا حکمراں تھا۔ روایات کے غلط ملط ہونے کی چند وجوہ ہو سکتی ہیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں فلسطین سے عبرانیوں کی جلاوطنی کے بعد ان کے چند گروہ ایران آگئے تھے۔ وہاں سے براہ خیبر کوئی عبرانی بزرگ کشمیر آئے ہیں۔ ۷۰ء میں رومنوں کے ہاتھوں یہودیوں کے دوسرے دیس نکالے جانے کے بعد یہ قوم ساری رومن ایمپائر میں تتر بتر ہو گئی۔ کریمیا، جنوبی روس اور ماوراء النہر میں بھی انہوں نے سکونت اختیار کی۔ بخارا میں یہودیوں کے قدیم ترین محلے آج تک آباد ہیں۔ وسط ایشیا پر عرب تسلط کے بعد مزید یہودی وہاں آئے کیونکہ عرب یہودیوں کے ساتھ سب سے اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ یہودی چینی ترکستان میں بہت زمانے سے موجود رہے ہوں گے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے جو سفیر فغفور چین کو بھیجا تھا اس کا ترجمان ایک یہودی تھا۔ چنانچہ ممکن ہے ان زمانوں میں یہودی کاشغر کے راستے کشمیر آئے ہوں۔ یا کیا پتہ ان سب سے پہلے حضرت سلیمانؑ ہی آئے ہوں۔

(یہ کوہ سلیمانؑ سرینگر میں ہے۔ اس کی چوٹی پر اب ٹیلیویژن ٹاور ہے اور جنات فضائی تصاویر پاکستان بھیجتے ہیں اور وہاں سے عملیات کے ذریعے فضائی تصاویر سرینگر پہنچتی ہیں اور دونوں طرف کے عکسی موکلوں کے ذریعے نفسیاتی معرکے جاری رہتے ہیں)

وادی کشمیر کی عبرانی روایات واقعی قابلِ غور ہیں۔ گہرے کنوئیں کو وہاں بابل کہا جاتا ہے۔ دگہرے کنوئیں کو ہمارے ہاں وادی گنگ وجمن میں

باولی کہا جاتا ہے۔ کیا یہ لفظ بھی بابل کی بگڑی ہوئی شکل ہے؟ شہر سرینگر کے اندر ایک چھوٹی سی عمارت ہے اندر ایک نہایت طویل تابوت جو قبلہ رو نہیں (فیض آباد اودھ میں برگد تلے ایک لمبے طویل قبر حضرت شیث کی بتائی جاتی ہے کیا انبیاء اتنے دراز قد ہوتے تھے اور حضرت شیث کی اودھ پہنچنے کی روایت کس طرح تیار ہوئی؟ اسی طرح جدہ میں اماں حوا کا مزار ہے یعنی وہ بنی آدم کی جدہ تھیں) تو اس انوکھے مقبرے واقع سرینگر میں مزار کی جالی کے اوپر لکھا ہے۔ صرف اتنی عبارت پڑھی جا سکی:

"در جوار ایشاں سنگ قبرے واقع شد۔ نزد عوام مشہور است آنجا پیغمبر از زمان سابقہ در کشمیر مبعوث شدہ بود۔ ایں مقام پیغمبراں معلوم ...... دروں کتاب نام پیغمبر یوز آصف نوشتہ۔"

رسول کریمؐ خاتم الانبیاء تھے۔ ان سے قبل کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ستر پیغمبر گزرے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کا نام یوز آصف رہا ہو۔ بہر حال، یہ مزار اسلام سے قبل کے کسی عبرانی بزرگ کا ہے کیونکہ قبلہ رو نہیں حضرت سلیمان کے وزیر کا نام بھی آصف تھا۔

اور مرزا غلام احمد قادیانی کی مشہور تھیوری کہ یہ حضرت عیسیٰ کا مزار ہے۔ مع حضرت مریمؑ تشریف لائے تھے۔ راہ میں ایک پہاڑ پر قیام کیا جو مریم کی وجہ سے کوہ مریم اور پھر کوہ مری کہلایا۔

راج ترنگنی

کلہن پنڈت کا باپ چمپک کشمیر کے مہاراجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) کا عہدیدار تھا۔ یہ وہی ہرش صاحب ہیں جنہوں نے مندروں کو تاراج کیا اور سونے چاندی کی مورتیاں پگھلوا کر ان کے سکے ڈھلوائے۔ بقول پروفیسر کیتھ موصوف ہندوستان کے نیرو کہلائے جا سکتے ہیں۔

راجہ کے قتل کے بعد چمپک سیاست سے ریٹائر ہو گیا۔ کلہن غالباً ۱۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کے زمانے میں کشمیر کے سیاسی حالات ناگفتہ بہ تھے۔ راجگان آئے دن ہلاک کیے جا رہے تھے۔ بغاوتیں اور شورشیں اور درباری سازشیں جاری تھیں۔ تب ہی کلہن نے بعہد مہاراجہ جے سنگھ ۱۱۴۹ء میں منظوم تاریخ کشمیر بزبان سنسکرت رقم کی۔ گویا کشمیر کا شاہنامہ کشمیری زبان میں اس کا نام در

"راجہ ترنگ" ہے۔

کلہن نے دگرگوں عصری حالات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اس سے قبل کی صدیوں کے متعلق بعض تامبر پتر، سرکاری دستاویزات مندروں اور عمارتوں پر کندہ تحریریں اور سکے کلہن کے ماخذ تھے لیکن قدیم الایام کے بارے میں گھپلا کر گیا اور عوامی روایات اور نیلمت پران وغیرہ پر بھروسہ کیا۔ کیونکہ بہرحال اہل ہند بنیادی طور پر (AHISTORIC) تھے اور میڈیول مسلمان عربوں کے برعکس ان کے ہاں تاریخ نویسی یا فلسفہ تاریخ کی کوئی سائنٹفک روایت موجود نہیں تھی۔

ڈاکٹر بیری ڈیل کیتھ ریجلیس پروفیسر آف سنسکرت، اڈمبرا یونیورسٹی مصنف "اے ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر" اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس لندن ۱۹۲۸ء) کے خیال میں راجہ گونند قطعی فرضی ہے جو بقول کلہن پنڈت سری کرشن پر متھرا میں حملہ کرتا ہے۔ بل بھدر اکے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اس کا لڑکا دامودر اول بھی ہلاک ہوتا ہے۔ سری کرشن اس کی بیوی کو تخت پر بٹھاتے ہیں اس کا لڑکا گونند ثانی اپنی صغر سنی کی وجہ سے مہا بھارت میں حصہ نہ لے سکا۔ یہ سب وطن پرست کلہن کی افسانہ طرازی ہے تاکہ تاریخ کشمیر کی قدامت ثابت کر سکے اور اس طرح کشمیر بھی ہند قدیم کی سورمائی داستان میں شامل ہو جائے۔

تیسری صدی قبل مسیح کے اشوک اعظم کو وہ تقریباً دو ڈھائی ہزار برس قبل کھینچ لے جاتا ہے۔ وہ اشوک کا ایک لڑکا جالوک بتاتا ہے جس نے کشمیر میں بدھ مت پھیلائی۔ لیکن جالوک کا تذکرہ اور کہیں نہیں ملتا۔ وہ ہشک جشک اور کنشک کا ذکر ضرور کرتا ہے جو کشان نام ہیں ریاد کیجئے کشمیری مسلمانوں کی

عوامی روایت کے مطابق حر ت سلیمان بھی تین ترکستانی شہزادے ہشکت، کنشکت اور جشکت ہمراہ لائے تھے لیکن سعید بن بادشاہ مہرگل کو اس کے عہد کے سات سو سال قبل ہی پیش کر دیتا ہے اور راناد تیہ اوّل کا دورِ حکومت کلہن کے مطابق تین سو سال تھا پھر وہ ایسی دیو لائی باتیں بھی رقم کرتا ہے کہ ایک برہمن نے دیوتا نیل ناگ کی مدد سے کشمیر کو بدھ مت اور برف کے تودوں سے نجات دلائی۔ وہ سعید بن حکمراں تورامن کو فرضی راجہ گونند کی اولاد بتاتا ہے۔ لیکن در لابھ وردھن کشمیر کا پہلا تاریخی بادشاہ ہے جس کا کلہن نے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کے حالات تاریخی ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے آس پاس مشرقی ترکستان کے یوچی قبیلے کی ایک شاخ کشان نے شاکا قبائل کو زیر کیا۔ یوچی قبیلے کی دوسری شاخوں کے نام توتھاری اور ودغرہ (ڈوگرہ) تھے۔

کشان لوگوں نے مغرب کی طرف پہنچ کر وسط ایشیا کی باختری یونانی سلطنت کو تاراج کیا۔ کابل۔ باختر (بلخ) پشاور اور کشمیر پر قابض ہو کر اپنی مملکت بنارس تک پھیلا دی۔ کنشکت اوّل ان کا نامور بادشاہ تھا۔ اس نے بدھ مت اختیار کی۔ سرینگر کے نزدیک ہاروان کی کھدائی میں ٹائل برآمد ہوئے ہیں جن پر وسط ایشیائی شہسواروں کی تصاویر ہیں۔ ایک خاتون شلوار اور لمبا کرتا پہنے دوپٹہ لہراتی ڈھول بجا رہی ہے۔ بالکل آج کی پنجابی خاتون معلوم ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ شلوار قدیم وسط ایشیائی پہناوا ہے جو ترکی مشرقی یورپ، دیہی ایران، پنجاب اور سندھ پہنچا۔ کاٹھیاواڑ کے کسان جو شاکا بستھین حملہ آوروں کی اولاد ہیں۔

وہ بھی وسط ایشیائی وضع کی کرتی پہنتے ہیں اور دھوتی پیچدار اس طرح باندھتے ہیں کہ شلوار معلوم ہوتی ہے۔

توہاروان کے ان ٹائیلون پر خروشتی میں اعداد پڑے ہیں اور ٹوپیاں اوڑھے عورتوں کی تصاویر۔ کشمیر کے اکثر دیہات میں ازبکستان اور تاجکستان کی طرح عورتیں آج بھی ٹوپیاں اوڑھے رہتی ہیں۔

پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں کشان کو ماوراء النہر کی نئی طاقتور اقوام سفید ہن اور گورجروں نے مار بھگایا۔ ہن صاحبان نے گپتا سلطنت، اس طرف رومن ایمپائر کا تختہ الٹ دیا تورامن اور اس کا بیٹا مہرگل سفید ہون کے قہرناک مشہور بادشاہ تھے۔ ان دونوں کے سکے بھی ہاروان میں برآمد ہوئے ہیں۔ یہ اقوام وسط ایشیا میں سکندر کے جانشینوں کی بھلائی باختری یونانی تہذیب کے پروردہ تھیں، ان کی وجہ سے اس تہذیب کے موتیف کشمیر پہنچے۔

ساتویں صدی عیسوی کا درلابھ وردھن پہلا کشمیری الاصل طاقتور راجہ ہے۔ اس وقت فغفور چین ایشیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ چین اس وقت بھی ایک پراہلم تھا۔ درلابھ وردھن کا پوتا للت دتیہ چین کے حلقہ اثر میں رہا۔ للت دتیہ (۷۲۵ء۔ ۷۵۶ء) دمشق کے آخری خلفائے بنو اُمیّہ ہشام، ولید ثانی مروان ثانی اور بغداد کے خلفائے بنو عباس سفاح اور منصور کا ہمعصر تھا۔ فاتح عرب افواج وسط ایشیا اور سندھ پہنچ چکی تھیں۔ کشمیر پر متوقع عرب حملے کے خلاف للت دتیہ نے چین سے ملٹری ایڈ بھی مانگی اور سلطنت کی توسیع کرتا گیا۔ للت دتیہ ہندوستان کے زبردست بادشاہوں میں سے ہے۔ اس نے گپتا سلطنت کے زوال کے

بعد کشمیر کو ایک اہم سیاسی طاقت بنا دیا۔ بنگال کے راجہ کو مار ڈالا۔ قنوج کے راجہ یشو ورمن کو زبردست شکست دی اور قنوجیوں کی پوری فوج ختم کر دی۔ کشت و خون اور خوفناک جنگیں اور قتل عام محض بعد کی صدیوں کی خصوصیات نہیں ہیں۔ [illegible] کی کشمیری خانہ جنگی کے متعلق کلہن پنڈت لکھتا ہے کہ دریائے جہلم کا پانی لاشوں سے پٹ گیا تھا۔

للت دتیہ نے اپنی سلطنت بنگال اڑیسہ سے لے کر افغانستان اور کاشغر تک پھیلا دی تھی۔ مارتنڈ کے دشنو سوریہ مندر میں عہدِ للت دتیہ کے مختلف النوع تہذیبی عناصر اور اثرات ہیں۔ سورج دیوتا کی مورتی نے اس مندر میں ساسانی وضع کا لباس اور فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ سورج انڈو ایرانی قدیم دیومالا میں شامل تھا۔ ایران میں مہر کی پرستش کی جاتی تھی۔ وسط ایشیائی کشان بادشاہوں نے ہندوستان آ کر یہاں کے مذاہب اختیار کر لیے تھے کنشک اعظم (دوسری صدی عیسوی) بدھسٹ ہو گیا۔ ہوشک اور واسدیو اس کے جانشین تھے۔ واسودیو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ وشنو مت کا پیرو تھا۔ رومن وضع کے کشان سکوں پر پارتھین، باختری یونانی، ایرانی زرتشتی اور ہندوستانی موتیف ملتے ہیں۔ اور یونانی ایرانی ہندوستانی دیوی دیوتاؤں کی تصاویر مثلاً ہندوستانی شِو۔ ایرانی مہر مِتر (سورج) ماہ (ماہ)، آتشو (آتش)، تو ایرانی اسٹائل کے سورج دیوتا شاید عہد کنشک ہی میں کشمیر آ گئے ہوں گے۔ للت دتیہ کے زمانے میں ساسانی تہذیب باقی تھی۔ یہ قابلِ ذکر بات ہے کہ کشمیر کے علاوہ سارے ہندوستان میں بھی سُوریہ دیوتا اپنے مندروں میں ہمیشہ فل بوٹ پہنے پائے جاتے ہیں۔

ہیون سانگ اور البیرونی ان دو صاحبان نے بہت عاجز کر رکھا ہے ہر جگہ ہر موقع پر دونوں مع اپنی رپورٹ چھلاوے کی طرح موجود چنانچہ چچا ابو ریحان فرماتے ہیں "ہندوستان میں سورج کے معبدوں کے پروہت ایرانی مجوسی ہوتے ہیں" (ان کو ہند میں سوریہ اور اگنی کی پوجا کرنے والے مگ برہمن کہا جاتا تھا) بات سمجھ میں آتی ہے اس مخصوص صورت میں مہرمتر کی پرستش مع اس کے لوازمات کے ایران سے آئی تو ساتھ ہی اس کے پروہت بھی وہیں کے جائیں۔ خصوصاً البیرونی کے زمانے میں زیادہ سے زیادہ پارسی، ہندوستان آرہا تھا۔ ان کے کچھ دستور سوریہ مندروں میں ملازمت کر لیتے ہوں گے، مغچے مگ ہری بجن بن گئے۔

مارتند کے وشنو سوریہ مندر آفتاب (خدائے تخلیق وشنو کا ایک مظہر سمجھا جاتا تھا) کے ستون اور محرابیں رومن شیرین طرز کی ہیں۔ بت تراشی ہمعصر گپتا اسکول سے تعلق رکھتی ہے۔ دیواروں پر گنگا اور جمنا کی مورتیاں بھی موجود ہیں۔

اور عین ممکن ہے اقبال کے لاتی ومناتی آباؤ "گائتری منتر" پڑھتے اس رفیع الشان مندر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوں۔

اے آفتاب! روحِ روانِ جہاں ہے تو!
شیرازہ بندِ اخترِ کون و مکاں ہے تو!

للت دیتہ کے بنوائے اس حیرت انگیز مارتنڈ مندر کے آثار آج ایک لرزہ خیز رومن کھنڈر معلوم ہوتے ہیں۔

للت دیتہ ہمارے کلہن پنڈت کا ہیرو ہے۔ مورخ اس کے متھ سے راج

نیتی کی باتیں کہلواتا ہے۔ جن میں قابل ذکر یہ ہیں کہ سرحدی قبائل کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دو۔ مبادا وہ خوشحال ہو کر ملک پر حملہ کر دیں۔ کسانوں کو سال بھر کے استعمال سے زیادہ غلہ نہ رکھنے دو۔ اور حکومت کے اعلیٰ عہدے چند مخصوص اونچے خاندانوں کے افراد ہی کو ملتے رہنے چاہئیں (موخر الذکر اصول پر برصغیر میں آج تک عمل جاری ہے)

مزید یہ کہ ناقابلِ اعتبار عوام کی وفاداری پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔ (ہمارے سیاستدانوں پر یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے)۔

کشمیر سنسکرت زبان وادب وفلسفہ کا ایک اہم مرکز تھا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنڈتانِ کشمیر اپنی اعلیٰ تعلیم اور علم دوستی کے لیے آج تک مشہور ہیں خواہ وہ دلی اور یوپی میں سکونت اختیار کر چکے ہوں خواہ وادیٔ کشمیر میں رہتے ہوں! للت دتیہ کے پوتے ونئے دتیہ کے دربار سے معتمد دامودر گپت بھی منسلک تھا جس کی کتاب "کٹنی ماتا" (گویا طوائفوں کی ہینڈ بک) کا اُردو ترجمہ پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔

ونئے دتیہ علم دوست تھا لیکن رعایا کی لوٹ کھسوٹ بہت کرتا تھا۔ کشمیری حکمرانوں کے مظالم کی روایت بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ دتیہ خاندان سے ۸۵۵ء میں ورما خاندان نے تخت چھین لیا۔ راجہ اونتی ورما بے حد عیاش تھا اور شنکر ورما ظالم تھا اس کا بنایا ہوا ریونیو سسٹم بہت عمدہ تھا۔

کشمیر میں بہت سی خود مختار حکمران رانیاں بھی گزری ہیں امرت پربھا چندر لاتی دیدہ رانی، کوٹہ رانی۔ یہ بہت ظالم مشہور تھیں۔

ان کا خون اندرا گاندھی میں آیا ہوگا۔

سازش بدامنی اور قتل و خون ایک ملک و قوم کے زوال کی علامتیں ہیں۔ آخر میں راجگانِ کشمیر اتنے نالائق ثابت ہوئے کہ ان کی جگہ باہمت اور سمجھدار رانیوں نے ملک پر حکومت کی۔ ۹۵۰ء میں دیدہ رانی تخت نشین ہوئی اور ۲۲ برس فرمانروا رہی۔ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرے ہوئے کے سبب سے وادی کے باشندے ہمیشہ سے علیحدگی پسند رہے ہیں۔ بقول محمد ابن پنڈت ابوریحان البیرونی نے لکھا تھا کہ اہلِ کشمیر اپنے ملک کی حفاظت کے خواہاں اور اس کی حدوں اور دروں کی حفاظت کرتے ہیں اس وجہ سے ان سے لین دین مشکل ہے۔ گزشتہ زمانوں میں وہ اکّا دکّا غیر ملکی خصوصاً یہودیوں کو وادی میں داخل ہونے کی اجازت دیتے تھے۔ مگر اب وہ کسی ہندو کو بھی نہیں آنے دیتے جس سے وہ ذاتی طور پر واقف نہ ہوں (اس تحریر سے بھی کشمیر قدیم میں یہودیوں کی آمد و رفت کا سراغ ملتا ہے۔ جس کا ذکر باب دوم میں کیا جا چکا ہے) کلہن پنڈت اس فوجی امداد کا ذکر کرتا ہے جو کشمیر سے راجہ ترلوچن پال کو محمود غزنوی کے خلاف بھیجی گئی تھی لیکن کشمیر پر محمود کے ناکام حملے کا تذکرہ نہیں کرتا۔ وہ بھی بیرونی دنیا کے عصری حالات سے بے نیاز تھا۔ اور بے خبر کہ وسط ایشیائی ترک ایک نئی سیاسی طاقت بن کر ابھر رہے ہیں۔ مارکو پولو نے کشمیر کو جادو سحر کا دیش لکھا تھا۔ وہاں تنترک جوگیوں کا بہت عمل دخل تھا۔ کلہن بھی جادو کا قائل تھا۔ بہت جلد اس کوہستان کی گپھاوں میں شیومت کے سادھوؤں اور بدھ مت راہبوں کے علاوہ ایک اور قسم کے عابد سکونت اختیار کرنے والے تھے۔

رنچن شاہ، بڈشاہ، یوسف شاہ

رنچن شاہ ایک لداخی شہزادہ تھا جس کا پورا تبتی نام لہاچین گیالبو رنچن تھا۔ اس نے راجہ رام چندر کو قتل کر کے اس کی بیوہ کوٹہ رانی سے بیاہ کر لیا اور خود راجہ بن گیا۔ وہ ہندو مذہب اختیار کرنا چاہتا تھا مگر بقول پنڈت رام چندر رگک کشمیری برہمن ایک بھوٹا کو اپنانے پر تیار نہ تھے۔ ان کی ضد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اور رنچن سے رنچن شاہ کہلایا یہی نہیں بلکہ وہ یعنی

رنچن مع اپنے خاندان، امرائے دربار شیخ شرف الدین عبدالرحمٰنؒ ترکستانی عرف بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا چنانچہ اب مندروں اور بہاروں کے علاوہ نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

رنچن شاہ کی مسجد اور بلبل شاہ کی خانقاہ! (بلبل شاہ پہلے صوفی کہے جاتے

ہیں جو کشمیر تشریف لائے۔ رنچن اب سلطان صدرالدین والیٔ کشمیر کہلانے لگا۔
شاہ میر جو غالباً ایک تورانی مہم جو تھا ۱۳۱۳ء میں کشمیر آیا۔ رنچن شاہ کی وفات
کے چند سال بعد سلطان شمس الدین کے نام سے ۱۳۳۷ء میں تخت نشین ہوا۔
اس کی نسل میں سلطان سکندر اور سلطان زین العابدین جیسے بادشاہ پیدا ہوئے۔
کشمیر پر ۲۰ سلاطین نے حکومت کی ان میں سے سلطان شہاب الدین اقبال کا ہیرو ہے۔

عجم خاکِ ما شہاب الدین نژاد

(تعجب کی بات ہے کہ پروفیسر آرمری نے جاوید نامہ کے انگریزی ترجمے
میں سلطان شہاب الدین کو شہاب الدین غوری بتایا ہے!) کشور کشائی کا شوقین
تھا۔ بلتستان، لداخ، کاشغر، پنجاب، سندھ، کابل، سلطان فیروز شاہ تغلق کو اس
سے صلح کرنی پڑی۔ اس کی ہندو رانی کا نام لکشمی تھا۔ وسیع المشرب تھا۔ ہندو
وزیر نے رائے دی کہ جا تما بدھ کی مورتیاں پگھلا کر ان کے سکے ڈھلوائے جائیں
(اس تجویز میں غالباً کشمیری برہمن بدھسٹ آویزش بھی پنہاں ہوگی۔ دوسرے
مذاہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کی پالیسی کا تعلق مذہب سے زیادہ
سیاست سے ہے۔ آٹھویں صدی کیرالا کے جگد شنکراچاریہ کی تبلیغ اور برہمنیت
کے بعد سے کشمیر میں بدھ مت ختم ہو چکی تھی۔ محض لداخ باقی رہ گئی)،
تو سلطان نے جواب دیا ماضی میں بت اس لیے بنے کہ شہرتِ دوام حاصل ہو۔ اللہ
ملے اور تم کہتے ہو میں ان کو توڑ ڈالوں۔ ان بتوں کا تقدس کتنا گہرا ہے۔ لوگ کہیں
گے سلطان شہاب الدین نے اپنی ناموری کے لیے دیوتا کا بت توڑا۔

۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان شہاب الدین سید السادات امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ

کشمیر میں وارد ہوئے ہے

مُرشد آں کشور مینو نظر میر و درویش و سلاطین را مشیر (اقبال)

سید علی ہمدانی ۱۳۱۴ء میں پیدا ہوئے تھے - ایران کے کبریٰ ی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے جو سہروردی سلسلے کی ایک شاخ تھی -

شیخ نجم الدین کبریٰؒ (وفات ۱۲۲۱ء) ایرانی تصوف کی ایک اہم شخصیت ہیں - آپ کا فجح الغایت یا شاہد السماء - HEAVENLY - GUIDE کا نظریہ بہت مقبول تھا -

امیر تیمور کے مظالم سے بچنے کے لیے امیر تیموران کا رسوخ اور مقبولیت ختم کرنا چاہتا تھا حضرت علی ہمدانیؒ اپنے ہمراہ سات سو سادات (سر طامس آرنلڈ نے "دی پریچنگ آف اسلام" میں بھی یہی تعداد لکھی ہے) اور ایرانی ہنرمندوں صناعوں، فنکاروں اور قالین بافوں کا ایک بڑا گروہ ہمراہ لے کر کشمیر تشریف لائے -

وہ ایک تاریخ ساز کارواں تھا جو ایران، افغانستان اور کشمیر کے دشوار پہاڑوں اور گھاٹیوں کو عبور کر کے وادیٔ جنت نظیر میں پہنچا - شاہ ہمدانؒ نے وادی میں اسلام پھیلایا اور ان کے ساتھیوں نے ایرانی صنعتیں -

اقبال جاوید نامہ میں فرماتے ہیں -

سید السادات سالارِ عجم دست او معمارِ تقدیرِ اُمم
خطہ را آں شاہ دریا آستیں داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مردِ ایراں صغیر با ہنر ہائے غریب و دلپذیر

اس شاہ دریا آیتی نے سرینگر جہلم کے کنارے ایک حجرہ میں تبلیغ شروع کی زیادہ تر اہلِ کشمیر نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ کشمیر میں تصوف کے فروغ اور وسیع پیمانے پر قبولِ اسلام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کشمیری شیومت کے بنیادی نظریاتِ تصوف سے بہت قریب تھے۔ پوجا پاٹ کی رسوم سے علیحدہ یہ MONISTIC شیو فلسفہ اوائل نویں صدی میں کشمیر میں رائج ہوا۔ جب داسو گپتا نے ۱۸۲۵ء میں شیو سُتر لکھا۔ انسانی مساوات اور وحدت الوجود اس شیومت کے اصول تھے۔ اور اس کے مطابق خدا نے دنیا اپنی مرضی سے مادے کی مدد کے بغیر بنائی اور انسان بھی خدا سے قربت حاصل کر سکتا ہے، اگر اسے یہ محسوس ہو جائے کہ صفات و انوارِ الٰہی اس کے اندر موجود ہیں۔ ویشنو مت میں پُوجا پاٹ برہمن پروہت کا عمل دخل بہت زیادہ تھا شیومت میں انسان بغیر پروہت کے ہی شیو سے لو لگا سکتا تھا ابھینو گپتا (دسویں صدی) کشمیری شیومت کا دوسرا بڑا فلسفی تھا۔

کشمیر میں مسلمان رشیوں کا سلسلہ بھی بہت مقبول ہوا۔ بابا نور الدین عرف نندہ رشی اور اُن کے خلفاء۔ بابا بام الدین۔ زین الدین، لطیف الدین، نصیر الدین، مہر رشی صبور رشی۔ سلیمان رشی۔ حسین رشی، ان کے مزاروں پر آج تک خلقت جمع ہوتی ہے۔ اننت ناگ میں، ہردے رشی کا مزار ہے جن کے احترام میں لوگ چیت کے مہینے میں سات روز گوشت نہیں کھاتے۔

میر شمس الدین عراقی نے بلتستان اور لداخ میں شیعیت پھیلائی۔ کشمیر میں شیعہ اسی وجہ سے نظر آتے ہیں۔

کشمیر نے حیرت انگیز ہستیاں پیدا کیں، وسیع المشرب اور روشن خیال سلطان زین العابدین (۱۴۲۰ء - ۱۴۷۰ء) بڈشاہ کہلاتا ہے یعنی بڑا بادشاہ اس نے شال بافی شروع کروائی۔ سمرقند و بخارا و شیراز سے میوہ دار درخت منگوائے، نہریں کھدوائیں۔ وہ بھی ایک آئیڈیل قسم کا حکمران تھا۔

چک سلاطین شیعہ تھے، یوسف شاہ چک کشمیری آخری خود مختار سلطان تھا۔ اس کی محبوبہ زُون (چاند) یا حبہ خاتون شاعرہ تھی۔ یوسف شاہ خود بھی شاعری کرتا تھا۔ یوسف شاہ چک کشمیری عہد میں وہی داستان دہرائی گئی جو رچن شاہ اور اس کے بعد سیاسی بدامنی کے دور کی داستان دہرائی گئی۔ جب شاہ میر تخت و تاج پر قابض ہو گیا تھا، سازشیں، خانہ جنگی، خود بے چارے یوسف شاہ کو معزول کرنے کے لیے اس کے درباری امرا نے اکبر کو مدعو کیا، اکبر پہلے ہی توسیع سلطنت میں جٹا ہوا تھا کیوں نہ آتا۔

مغل بڑے باکمال لوگ تھے لیکن انہوں نے ہندوستان کے بعض نہایت غیر معمولی۔ ذہین، آرٹسٹک، آزاد خیال اور رومینٹک سلاطین کو نہایت بے دردی سے ختم کیا۔

مالوہ کا باز بہادر کشمیر کا یوسف چک سلاطینِ دکن بالخصوص ابوالحسن تانا شاہ ان کی کہانیاں المناک ہیں۔ مگر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلتی ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ہر دور میں ایسا ہوا ہے۔

مغل افواج پہلے بھی کشمیر پر حملے کر چکی تھیں مگر ناکام رہی تھیں اب کی مرتبہ یوسف شاہ کے بیٹے یعقوب خان نے مغل افواج کا جی توڑ کر مقابلہ کیا۔ مگر یوسف

شاہ کو مغل جنرل راج بھگوانداس سے صلح کرنا پڑی۔ مغل سرکار نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور یوسف شاہ اور یعقوب خان کو قید کر کے دور دراز صوبہ بہار لے گئے۔ یوسف شاہ نے راجہ بھگوانداس سے صلح کی تھی۔ مغلوں نے پیمان شکنی کی۔ راجہ بھگوانداس قول نبھانے والا غیور راجپوت تھا اپنے مغل آقاؤں کی اس وعدہ خلافی کی تاب نہ لا سکا خود کشی کر لی، اپنے عروج کے زمانے میں انگریز کمزور مظلوموں سے قدم قدم پر اسی طرح پیمان شکنی کرنے والے تھے اور آخری مغل بادشاہ کو رنگون لے گئے۔ سنا ہے پٹنے کے نزدیک ایک گاؤں کے ٹیلے پر اس بد قسمت کشمیری بادشاہ اور شہزادے کی قبریں موجود ہیں۔ نئی تحقیق کے مطابق حبہ خاتون بھی وہیں دفن ہے دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں . . . .

اقبال کے مشہور ساقی نامے کا پہلا مصرع ہے ۔ اقبال نے نشاط باغ میں بیٹھ کر کشمیر کے شاندار ماضی کو یاد کیا اور اپنے عہد کی زبوں حالی پر آنسو بہائے۔ اقبال سے قبل متعدد فارسی شعراء نے کشمیر کے مغلیہ باغات پر شعر کہے تھے اور محض جھیل ڈل کے کنارے مناظر قدرت اور بہتے پانی کے عاشق مغلوں نے جو باغات لگوائے ان کے کیا رومینٹک نام تھے، فیض بخش، فرح بخش عیش آباد، بحر آرا، نسیم باغ باغ جہاں آرا، باغ پری محل، باغ چہار چنار، ان باغات کی محفلوں کی تعلیو سے مغل مصوروں کے موتیف نے کشمیری قالینوں اور کشیدہ کاری کے شاہکاروں کو سجایا۔

اکبر نے ۱۵۸۶ء میں کشمیر فتح کیا تھا۔ سرینگر پہنچ کر حسین خان چک کے بنوائے ہوئے باغ میں ٹھہرا۔ فصیل قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا کیا دبدبہ اور جاہ و جلال رہا ہوگا۔ دنیا

کے چار بڑے حکمرانوں میں سے ایک اس وقت کے (BIG FOUR) میں۔
باقی تین انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ اوّل سلیمان اعظم سلطان ترکیہ اور ایران کے شاہ
عباس صفوہ تھے۔ تو بے چارہ یوسف شاہ چک اور حبہ خاتون کہاں تک
اس کا مقابلہ کرتے۔

پنڈت رام چند کک کا قول ہے کہ مغلوں نے کشمیر کو عہدِ وسطیٰ سے نکال
کر دورِ جدید میں داخل کیا۔ مغلیہ ایڈمنسٹریشن صنعتی ترقی، خوشحالی عہد مغلیہ کشمیر
کا دورِ زریں تھا۔ للت دتیہ شہاب الدین اور بڈشاہ کے بعد۔ رومان پرست شہزادہ
سلیم دو بار باپ کے ساتھ کشمیر آیا۔ چھ بار نورجہاں بیگم کے ساتھ۔ شاہ جہاں
داراشکوہ سب کشمیر آتے رہے اور عمارتیں، مسجدیں اور باغات بنوائے چلے
گئے۔ سنہ ۱۶۶۴ء میں اورنگ زیب تین ماہ رہا۔ شالیمار کے درجہ دوم فیض بخش
میں بیٹھا رہا۔ طبیعت بے چین ہوئی۔ زعفران کا شگوفہ دیکھے بغیر واپس چلا گیا۔ حالانکہ
قاعدہ تھا کہ زعفران دیدہ باید راہ ہندوستان گرفت اور رنگ زیب دراصل ایک
"آؤٹ سائڈر" تھا۔ اور (MISFIT) بیحد ذہین تھا اور آیئڈیلیسٹ۔ لیکن کنفیوزڈ۔
نجانے اصلیت میں وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ جدید ذہن بھی رکھتا تھا جیسا کہ اس کے خشمناک
اور طنزیہ خط سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اپنے لڑکپن کے استاد کو لکھا تھا۔

کہ مولانا آپ نے مجھے بتایا کہ انگلستان کا بادشاہ ہمارے معمولی راجاؤں سے بھی
کمزور ہے۔ یورپ ایک جزیرہ ہے۔ آپ نے انٹ سنٹ مجھے تعلیم دی۔
آپ کو حالات حاضرہ کی کوئی واقفیت نہیں۔ اورنگ زیب ایک عجیب وغریب
انسان تھا اگر ماہر نفسیات اس کے زمانے میں موجود ہوتے تو اس کی تحلیلِ نفسی

کرتے۔ آپ اسے وقت سے پہلے پیدا ہونے والا بادشاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس کی بیٹی شہزادی روشن آرا بیگم اس کے ہمراہ کشمیر آئی تھی اسی سفر کو ذہن میں رکھ کر انگلستان کے آئرش نژاد رومینٹک شاعر طامس مور نے ۱۸۱۷ء میں وہ مشہور منظوم رومان لکھا ”لالہ رخ“ اورنگ کی بیٹی لالہ رخ جس کی نسبت شاہ بخارہ سے ہو گئی ہے شادی کے لیے عازم کشمیر ہوتی ہے۔ اس کے کارواں کے خدام میں ایک مطرب خوشنوا اور شاعر فراموز بھی شامل ہے وہ سفر کے دوران فراموز پر عاشق ہو جاتی ہے مگر اس خیال سے کہ شاہ بخارا سے اس کی منگنی ہو چکی ہے وہ حکم صادر کرتی ہے کہ اس اجنبی شاعر کو اس کی خدمت میں حاضر نہ ہونے دیا جائے۔ کشمیر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شاہ بخارا ہی نے دراصل اس مطرب کا بھیس بدل رکھا تھا۔ انگلستان اور یورپ میں اپنی اشاعت کے بعد لالہ رخ نے بے حد مقبولیت حاصل کی کیونکہ اس وقت ایشیا میں برطانوی فتوحات کی وجہ سے پراسرار، رومینٹک مشرق سے دلچسپی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ادب کا رومانی دور تھا (کچھ عرصے کے لیے لالہ رخ کو کیٹس اور بائرن کی تخلیقات کے ہم پلہ سمجھا گیا) مغلوں کی بنوائی ہوئی عمارات و باغات اور ان کی متعارف کی ہوئی آرٹسٹک صنعتوں کے ذریعے آج سارے ہندوستان اور کشمیر کو کثیر غیر ملکی زرمبادلہ تجارت اور سیاحوں کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور شاید اسی وجہ سے ہندوستان کشمیر سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔

کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

کشمیر کے حالات کبھی یکساں نہیں رہے، زلزلے، قحط سیلاب چوبی مکانوں کی آتشزدگی، حکام اور بادشاہوں کے مظالم، اس فنکار، نرم مزاج اور جفاکش (بقول اقبال، زیرک اور ادراک، خوش گل) قوم نے کم از کم ریکارڈ ہسٹری کے دو ہزار سال میں تمام آفات سماوی و ارضی کو نہایت صبر سے جھیلا ہے۔

انحطاطِ سلطنتِ مغلیہ ۱۷۵۳ء میں کشمیر پر احمد شاہ درانی نے تسلط جمایا۔ ۱۸۱۹ء میں سکھوں نے۔ ع

قوم سکھاں وارد کشمیر شد

کشمیر میں پٹھان، خالصہ اور ڈوگرہ راج کے مظالم ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغبان　　افغاں کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد

اِدھر جموں کے یہاں گلاب سنگھ نے اپنے آقا سلطان خاں کو رنجیت سنگھ کے حوالے کیا۔ صلے میں سکھ فوج میں عہدہ پایا۔ ڈوگرہ بغاوت فرو کرنے کے صلے میں رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۰ء میں جموں گلاب سنگھ کو جاگیر میں دے دیا۔ ۱۸۴۱ء میں جب انگریزی فوج جلال آباد میں تھی گلاب سنگھ نے انگریزوں کی مدد کی۔ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کے خلاف جنگ میں بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس وفاداری کے انعام میں ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے روز امرتسر میں انگریزوں نے کشمیر مبلغ چالیس لاکھ روپے میں گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا۔

دہقاں و کشت و جوئے خیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند　　(اقبال)

"تحریکِ حرّیت کشمیر از رشید الدین تاشہ میں رونگٹے کھڑے کر دینے والے حالات درج ہیں۔ ۱۸۴۹ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں کے مشورے سے لدّاخ کے بادشاہ حیات محمود خاں تسپال نمیگل پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ بارہ سو لدّاخی قید کئے چار سو زندہ پانی میں ڈبو دیئے گئے دو سو کو درختوں سے لٹکا کر پھانسی دی گئی۔ حیات محمود خاں کو بُری طرح قتل کیا گیا۔ گلاب سنگھ کے عہد میں حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ استحصال۔ بھاری ٹیکس غلامی۔ جون ۱۸۸۶ء کے روز چار ہزار کاریگر ہجرت کر کے لاہور چلے گئے۔

۱۸۳۳ء میں ایک انگریز لفٹیننٹ کرنل تھروپ سیاحت کے لیے کشمیر

آیا تھا۔ امیر زادی پر عاشق ہوا۔ اس سے نکاح کر کے لندن لے گیا۔ ان کا بیٹا رابرٹ تھروپ ۱۸۶۵ء میں کشمیر آیا۔ یہاں کے بھیانک حالات دیکھ کر اس نے MISGOVERNMENT IN KASHMIR کے عنوان سے کتاب لکھی۔ کچھ عرصے بعد وہ نوجوان کوہ سلیمان پر مردہ پایا گیا۔ شال بافوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ انہوں نے احتجاجی جلوس نکالا حکام نے اٹھائیس کو دریائے جہلم میں دھکیل کر ہلاک کر دیا۔ روسی ریچھ کے خطرے کی وجہ سے کشمیر کی اہمیت بڑھتی گئی۔ سرینگر میں برطانوی ریذیڈنسی قائم ہوئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ اس کے جانشین تھے۔ مہاراجہ امر سنگھ ان کے بھائی تھے۔ اور ہری سنگھ بھتیجے، جو ۱۸۲۶ء میں گدی پر بیٹھے۔ ان کے دور کی ایک سیاسی سازش میں ملکہ پکھراج بھی شامل تھیں۔

خانقاہِ معلیٰ کے مجاہد

جاوید نامے میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور طاہر غنی کاشمیری والی نظمیں کشمیر کے متعلق ہیں اور ارمغانِ حجاز میں شامل "ملازادہ ضیغم لولابی" والی نظم (پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب، مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب، اے وادیٔ لولاب) بہت مشہور ہے اور مظفر آباد ریڈیو سے روزانہ گائی جاتی ہے۔ اسی طرح کشمیر کے کلیشے بن چکے ہیں (ابھی ابھی معلوم ہوا کہ اس رپورتاژ کا عنوان بھی سرینگر کے ایک روزنامے کے روزانہ کالم کی سرخی ہے!)

جاوید نامہ میں زندہ رود شاہ ہمدان سے کشمیریوں کے متعلق کہتا ہے۔

دستِ مزدِ او بدستِ دیگراں ماہیِ رودش بہ شستِ دیگراں

اور سوال کرتا ہے

ما فقیر و حکمراں خواہر خراج ‏ ‏ ‏ چیست اصل اعتبارِ تخت و تاج

ارمغانِ حجاز میں ؎

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر ‏ ‏ ‏ کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

کہہ رہا ہے داستاں بیدادیٔ ایام کی ‏ ‏ ‏ کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ ‏ ‏ ‏ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک ‏ ‏ ‏ گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یک دانہ

شیخ محمد عبداللہ اور چند اور نوجوانوں نے جو علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر لوٹے تھے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۳۰ء کے روز سری نگر میں ایک ریڈنگ روم قائم کیا۔ ۸۲ روپیہ چندہ اکٹھا کیا گیا اور اس کمرے میں سیاسی میٹنگیں ہونے لگیں۔ یہ کشمیر کی باضابطہ جدوجہد کا آغاز تھا۔ حکومت کے استبداد کے خلاف ۲۵ رجون ۱۹۳۰ء کے روز حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی خانقاہ معلّی کے صحن میں زبردست جلسہ منعقد ہوا۔ تحریک زور پکڑتی گئی۔ پولیس فائرنگ میں سترہ اشخاص شہید ہوئے۔ چوہدری غلام عباس اور شیخ عبداللہ گرفتار کر لیے گئے۔ ۲ ستمبر ۱۹۳۱ء میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد پھر ۲۵ ہزار کے مجمع پر پولیس نے گولیاں چلائیں۔ خون کے دریا بہہ گئے۔ پولیس نے سنگینوں کی نوک سے عورتوں کو بھی زخمی کیا۔ خانقاہ محلہ اور جامع مسجد تحریکِ آزادی کے دو اہم مستقر بن گئے۔ تاریانے، قید و بند، ہندو مسلم فساد، فرقہ پرست سیاسی جماعتیں، میر واعظوں کی باہم کشیدگی، قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کا تصادم ۱۹۳۷ء تک سب زور شور سے چلتا رہا۔ اسی زمانہ میں خانقاہ معلّی کے جلسے میں ایک نوجوان نے در

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ" والا شعر پڑھا جس کی پاداشں میں اسے ڈیڑھ سال کی قید سخت کی سزا ہوئی۔

شیخ عبداللہ کے ایماء پر کشمیری مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۵ء کو مسلم کانفرنس کے اجلاس میں کشمیری ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ جون ۱۹۳۹ء میں صادق صاحب کی زیر صدارت مسلم کانفرنس کشمیر کے مسلمانوں ہندوؤں اور سکھوں کی مشترکہ "نیشنل کانفرنس" میں تبدیل کر دی گئی۔

سیاسی جدوجہد کے دوران مہاراجہ کی پولیس فائرنگ سے کئی عورتیں بھی شہید ہوئیں۔ جاوید نامہ میں غنی کاشمیری فرماتے ہیں۔

پیچ می دانی کہ روزے در ولر	موجۂ می گفت با موج دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم	بجز تا یک دم بساحل سر زنیم

رخت باکاشمر کشا

جموں ۱جون ۱۹۷۹ء۔ سابق راجگانِ کشمیر کا شاہی مہمان خانہ جواب سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے۔ کمروں میں بیش قیمت قالین۔ غسلخانوں میں اسکاٹ لینڈ سے درآمد کیے ہوئے (SHANKS) کے ٹب اور واش بیسن جو برطانوی ہند کی کوٹھیوں میں بھی موجود تھے۔ برآمدوں اور خالی کمروں میں چوبیس گھنٹے فل سپیڈ پر پنکھے چلتے رہتے ہیں تاکہ سرکاری بجلی بے دریغ ضائع ہوتی رہے!

سرینگر کے راستے میں کرشن چندر کا۔ ٹوٹے اور گڈ۔ سُرخ رنگ کا دریائے چناب لکڑی کوشح کے ہمراہ بہتا جا رہا ہے۔ مگر اس کا رُخ پاکستان کی طرف ہے۔ سامنے پیر پنجالی کے سلسلے کی دوسری طرف وادی ہے۔ دنیا کے الگ تھلگ کشور مینو نظیر، طویل، باریک بانہال سرنگ (جسے پنڈت جواہر لال نہرو

بنواگئے، سے گزر کر پہاڑوں سے اتر کر اچانک میرسپر فضا وادی کشمیر بید کے جھرمٹ، دھان کے کھیت، چشمے، شاہراہ کے دونوں طرف سفیدے کی قطاریں، دریائے جہلم سرینگر۔

۱۹۴۸ء میں مجاز مرحوم ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے سرینگر آئے تھے۔ واپسی پر دوستوں نے پوچھا سرینگر کیسا ہے فرمایا بس "مارہرہ شریف ہے" آج وہ ایک وسیع ماڈرن ترقی یافتہ شہر ہے۔ جو مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔

ریذیڈنسی روڈ پر مہاراجہ اور برطانوی عہد کی یادگار، کوٹھیاں، سرہری سنگھ کلب، گرجا گھر جیسے بلوے کے حامیوں نے جلا کر خاک کر دیا۔

سرکٹ ہاؤس کے ایک دریچے کے سامنے اخروٹ کی ٹہنی پر واقعی کلغی دار بلبل بیٹھی ہے۔ اور نیچے جہلم بہہ رہا ہے۔

یہ ایک عاشقِ رسول صوفی منش قوم ہے ڈرائنگ روم کے دریچے میں ایک روز فجر کے وقت ایک ملازم باآوازِ بلند اس طرح نماز پڑھ رہا تھا گویا خدا اور اس کا رسولؐ اس کے سامنے موجود ہیں اور وہ والہانہ ان سے مخاطب۔ دوسری شام وہی ملازم باغ میں "عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں" گنگناتا سنائی دیا۔

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوائے باشد

جہلم پر ایک شکارے پر بیٹھی کشمیری عورت اطمینان سے گدلا پانی اپنے اوپر انڈیل کر کپڑوں سمیت نہا رہی تھی۔ غلام نبی اپنا شکارہ لے کر اپنے بہت بڑے ذاتی ہاؤس بوٹ کی طرف گیا اور کسی کو آواز دی۔ کھڑکی کھلی، سر پر سبز

رومال باندھے ایک حسین عورت نے جھانکا۔ اسٹو۔ اور کیتلی غلام نبی کو دی۔ غلام نبی نے شکارہ پل کی سمت کھینا شروع کیا۔ یہ سارا منظر افسانوی تھا الف لیلیٰ۔ ہارون رشید کے زمانے کا دجلہ۔

دریا پر دور رویہ خوشنما آبی ہوٹلوں اور آبی مکانوں اور آبی دوکانوں اور شکاروں کے غلط ملط انگریزی میں لکھے ہوئے نام سبز پاتی، نیلا پانی، گہرا پانی، گلشنِ رواں، بید کی آبی جھرمٹ، آبی کشت زار پھولوں سے ڈھکی مہمان سرائیں۔

ایک خاتون سیاہ چشمہ لگائے کشمیری پوشاک میں ملبوس تیزی سے اپنی ڈونگی کھیتی برابر سے نکل گئیں۔ جہلم پرانے شہر کے وسط سے گزر رہا ہے۔ دونوں طرف پچر لبیک سہ منزلہ چوبی مکان۔ ایک اونچے مکان کی آخری سیڑھی پر بیٹھی کوئی منی سی بچی نہایت اطمینان سے پیالی میں دریا کا پانی بھر رہی تھی۔

نگین کے نزدیک غلام نبی نے ایک آبی کنج میں رک کر آواز دی چند لڑکیاں ایک کشتی میں کھانا پکا رہی تھیں۔ غلام نبی نے اسٹو۔ اور کیتلی ان کو تھمادی وہ غالباً اس کی رشتہ دار تھیں واپسی میں وہاں بیٹھ کر چائے پئے گا۔

نگین جھیل۔ نیلے پانی کے اندر چاروں طرف سرسبز درخت گویا نیلم کے گرد زمرد۔ سایہ دار ہرے بھرے آبی راستے جن پر ڈونگیاں رواں تھیں۔

آگے ڈل میں ایک چار سالہ بچی طویل ناؤ کی بالکل نوک پر نہایت اطمینان سے بیٹھی چپو چلا رہی تھی۔ کشتی کے عقب میں اس کا باپ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا تھا۔

ڈل خاصی ڈل ہے۔ دور مغربی سیاحوں کے بجد ہنگے ہاؤس بوٹ، کنارے

پر نشاط باغ مغرب کے دھندلکے میں ملفوف تھا۔

تاج محل کو مرمریں خواب کہا جاتا ہے۔ حضرت بل کی تھی مسجد جس میں موئے مبارک محفوظ ہے ایک اور مرمریں خواب ہے۔ "ڈل کنارے حضرت بل کے گھاٹ شکارا رکا" اب ہم بھی مغرب کی نماز پڑھنے جاتا ہے۔ یہ مسجدِ نبوی کی طرز پر بنایا گیا ہے۔" غلام نبی نے کہا۔

گھاٹ پر صاف ستھری دوکانیں، نان کی ایک دوکان پر ایک حسین لڑکی تنہا، ایک تصویر کی طرح خاموش بیٹھی تھی، ساکت عبدالرحمٰن چغتائی کی ایک تصویر۔ کوئی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ کشمیری بدنظر نہیں ہیں۔ گلف عرب یہاں نہیں آئے کیونکہ یہاں بے نقاب حسن کی فراوانی کے باوجود اتنی پاکیزگی ہے کہ ان کے عیاشی کے لوازم مفقود ہیں۔

گھاٹ پر ایک اور دوکان میں گول ٹوپی اوڑھے ایک فرغل پوش بزرگ حقّہ پی رہے تھے۔ یہ سارا منظر مڈل ایسٹرن اور سنٹرل ایشین تھا۔ دو ہزار سال کے متواتر کشان، ترکستانی، ایرانی مغل اثرات کے بعد اگر ایسا نہ ہو تو کیا ہو؟

مسجد حضرت بل کے احاطے میں پھاٹک کے نزدیک ایک پختہ منڈیر پر آلتی پالتی مارے غلام نبی شکاروے، عبادت میں اسی والہانہ انداز سے محو ہو گیا۔ جس طرح سرکٹ ہاؤس کا ملازم اللہ سے لو لگاتا ہے۔

ہارون، چشمہ شاہی، شالیمار باغ۔ نشاط۔ ٹورسٹوں کے ہجوم۔ نشاط باغ سے جھیل کے اس پار پر مسجد حضرت بل صاف نظر آ رہی ہے۔

مغل شہنشاہ، ان کی بیگمات اور شہزادیاں اور مغل صوبیدار جھیل پر چراغاں

کرواتے تھے اور یہاں بیٹھ کر غروب آفتاب اور چراغاں کا نظارہ کرتے تھے۔
نیچے سیاحوں کے لیے دو کانوں کی قطار کے سرے پر چنار کے نیچے ایک بوڑھا ٹوپیوں پر اُون سے کشیدہ کاری میں مصروف ہے۔ بارش آئی تو وہ اپنا اثاثہ پھرتی سے سمیٹ کر ایک کونے میں دبک جاتا ہے۔
نشاط باغ میں بیٹھ کر جون ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبالؒ نے ساقی نامے میں لکھا تھا:-

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تار ہے

آج ۱۹۷۹ء میں سرینگر کے نئے کروڑ پتی تاجروں کا مال ساری دنیا میں جاتا ہے ان کی وجہ سے ایک نیا دولت مند طبقہ وجود میں آچکا ہے۔ لیکن کشمیری کاریگروں کی حالت نسبتاً پہلے سے بہتر ہے۔
کل رات سون مرگ میں برف پڑی تھی۔ یہ مئی ۱۹۷۹ء کا مہینہ ہے اور "اتر پردیش اور بہار میں لوگ لُو سے مر رہے ہیں۔ سون مرگ کے مکانوں کی چھتوں پر سے برف پگھل رہی ہے۔ ہوٹل کے سبزہ زار پر متمول ہندوستانی سیاحوں کا ہجوم۔
دادر بمبئی سے آئے ہوئے ایک مرہٹے حیرت سے کہہ رہے ہیں۔
"کشمیر کی تو ہر عورت سائرہ بانو ہے۔"
ہمارا معیار حُسن بھی فلمی ہے۔
سون مرگ سے سری نگر تک کے کچے خطرناک پہاڑی راستے کے برابر

سندھ ندی اچھلتی کودتی چلی آرہی ہے۔ یہ مقامی سندھ ندی ہے۔ انڈس
نہیں۔ سڑک کے دونوں طرف برف کی چٹانیں، گلیشیر۔ دریا کوہستان کی سیال
روحیں ہیں۔ گلیشیر کوہستان کے منجمد تصورات۔ صنوبروں کے جنگل، پہاڑوں
کے راگ، بادل پہاڑوں کے آوارہ خیال۔ سون مرگ کے راستے میں کھیر بھوانی
کا مندر ہے۔ ایک پنڈت زعفرانی صافہ باندھے چنار کے نیچے کھڑا ہے۔ کشمیر
کی قدیم روح۔ نیلمت پران اور رتناکر پران اور شوسترا اس کے نسلی
حافظہ میں محفوظ۔

کہ یہ عشق سارا محمدیؐ ہے

سرینگر سے پہلگام جاتے ہوئے شہر کی ایک سڑک پر اِبل کی گھنی بیل میں
چھپی ایک پنج منزلہ الف لیلوی پرانی عمارت نظر آئی چوبی نقش ونگار کی
بے شمار کھڑکیاں، نچلی منزل کی ایک کھڑکی میں سے ایک سرخ و سفید نوجوان
نے باہر جھانک کر سڑک پر کھڑے ایک آدمی سے کچھ بات کی۔ طامس مور کی لالہ
رخ کا قافلہ ایسی ہی کسی عمارت میں آکر اترا ہوگا۔

پہلگام کے راستے میں اونتی پور کا مندر مارتنڈ کے مندر کی طرف رومن طرز
کے کھنڈر۔ حیرتناک۔ کشمیر کی ٹورزم روز افزوں ترقی پر ہے۔ ہر روز دو ہزار
سیاح وادی میں داخل ہوتے ہیں اونتی پور کے مندر کے سامنے پہلگام جانے
والی لگژری کوچیں ایک درجن سے زیادہ ایک قطار میں کھڑی ہیں۔
پہلگام اور گلمرگ کو ہندوستانی فلموں کی شوٹنگ نے بری طرح کمرشلائز

کر دیا ہے۔ ماہِ عسل منانے والے ہندوستانی جوڑے جو زیادہ تر پہلگام
آتے ہیں۔ فوٹوگرافروں کی دوکانوں پر ان کی انتہائی فلمی پوز کی رنگین تصاویر، خچروں
کے نام راجکپور اور ببی، یہ ہمارا نیا فلمی کلچر ہے۔ پی ڈبلیو ڈی بنگلے کے عین
سامنے کچھ فاصلے پر لڈر بہہ رہا ہے پُر شور اور تُند رو۔ رات کے سناٹے میں
اس کی آواز زیادہ اُونچی ہو جاتی ہے۔ کوہ پیمائی کی پوشاک میں ملبوس جرمن سیاح
حیرت سے ان ہندوستانی خواتین کو دیکھتے ہیں جو اُونچی ایڑی کی جوتیاں
اور زرق برق ساڑھیاں پہنے، طلائی زیورات سے لدی، خچروں پر سوار
پائین کے جنگلوں سے گزر رہی ہیں۔ زیادہ تر ہندوستان کا نو دولتا طبقہ پہلگام
اور گلمرگ آتا ہے۔

پہلگام میں افلاس زیادہ ہے کیونکہ یہاں کے باشندے صرف موسم گرما
میں آنے والے سیاح کے سہارے گزر بسر کرتے ہیں۔ سرینگر، اننت ناگ،
بارہ مولا زیادہ خوشحال اضلاع ہیں۔ پہلگام کے ان غریب کشمیریوں کے
چیتھڑے اتار کر ان کو سوٹ پہنا دیئے جائیں تو یورپین معلوم ہوں۔ ایک خچر والا
بلونڈ لڑکا غلیظ تار تار کپڑے پہنے قسکلاً بالکل نارویجن معلوم ہو رہا تھا
اور اتنی شدید غربت کے باوجود ایمانداری کا یہ حال ہے کہ پنجابی، سندھی
مارواڑی سیاح عورتیں اور دُلہنیں زیوروں سے لدی اکیلی اِدھر اُدھر
پھرتی رہتی ہیں، کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔

مشرقی یوروپین چہرے مہرے والے اسد اللہ نے گھوڑے کی لگام تھامتے
ہوئے کہا "ہمارا باپ یہی کام کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔ اب گھر پہ بیٹھا ہے۔

جاڑے آنے پر شہر سے چاول لاکر رکھ لیں گے۔ یا تریوں کو امرناتھ لے جائیں گے۔ دو سو روپے میں۔"

اسد اللہ۔ علی محمد۔ غلام محی الدین۔ خچران کے بھائی ہیں۔ ان کے اُن داتا۔ گیارہ سالہ بچہ علی محمد چڑھائی پر تیزی سے دوڑتا جاتا ہے۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے بوڑھا ہو جائے گا۔ یا شاید اس وقت تک حالات بہتر ہو جائیں پہلے اس سے بدتر تھے "راجہ کے زمانے میں ہمارے باپ کو بیگار کرنی پڑتی تھی۔ اس کے پاس جوتے نہیں تھے جناب، پاؤں پر گھاس باندھ کر سامان ڈھوتا تھا۔ پہاڑوں پر سامان لے جاتا تھا" اسد اللہ نے کہا۔

گوجر مزدور سب سے زیادہ خستہ حال ہیں۔ چیتھڑوں میں ملبوس سانولے۔ سیاہ داڑھیاں۔ کشمیریوں سے نسلاً مختلف۔

لِدر کے کنارے مسجد میں اذان ہوتی ہے اور برفپوش پہاڑوں سے ٹکراتی ہے۔ بنگلے کا چوکیدار غلام محمد نماز پڑھ کر واپس آتا ہے بھورے بال، نیلی آنکھیں۔ لیکن نوڑک کے بجائے انگریز معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو ETHNIC معلومات سے دلچسپی ہو تو انڈو آرین نسلوں کی یہ شباہتیں فسوں خیز ہیں۔ وادی میں باقی دنیا سے علیحدہ رہے جانے کی وجہ سے یہ لوگ اپنی یوریشین اسٹیپ ان خنکاری جڑوں سے زیادہ نہیں کٹے۔

اسی طرح چترال اور ہنزہ کے لوگ عہدِ سکندر کی باختری یونانی افواج کی نسل کے بتائے جاتے ہیں۔

غلام محمد بھی —— بیحد مغموم ہے "دو جاتیوں" کے گھر جلانے کے اجتماعی تاوان

میں اسے بھی دس روپلے بھرتے پڑے جو اس کے لئے بڑی رقم ہے۔ وہ بھی بہت غریب آدمی ہے۔

"تمہاری اپنی کھیتی باڑی ہے غلام محمد؟"

"اپنی ہوتی جناب تو ہم یہاں چوکیداری کیوں کرتا" اس نے اداس آواز میں جواب دیا۔

"جاڑوں میں یہاں سردی نہیں لگتی؟"

"لگتی ہے جناب! ہم جنگل کے جانور ہیں جانوروں کی طرح سب مشکلیں جھیلنے کی عادت ہے۔"

"کبھی حضرت بل گئے ہو؟ موئے مبارک کی زیارت کی؟"

"زیارت موئے مبارک اگر دل سچا ہو تو یہیں نظر آ سکتا ہے جناب!"

"زیارتوں پر جاتے ہو۔؟"

"میں جہاں جاتا ہوں زیارتیں میرے ساتھ چلتی ہیں جناب!"

صدیوں کی سخت کوشی اور مصائب نے ان لوگوں کے دل گداز کر دیئے ہیں۔ مدارجِ تصوّف حاصل کرنے کے لیے اجتماعی ریاضت کی ہے!

"کبھی خواب میں رسولؐ اللہ کی زیارت کی؟"

جھینپ کر خاموش۔

"کی کبھی زیارت؟"

"ہم کیا کہہ سکتا ہے جناب؟"

"سچ سچ بتاؤ؟"

"جناب دو بار"

"کہاں؟"

"ادھر ہی جناب، اپنے کمرے میں۔"

"ماشاءاللہ، بہت خوش نصیب آدمی ہو۔"

"جی ہاں جناب۔"

"اور یہ جو کانگڑی تمہاری ہے رات کو سوتے میں آگ نہیں لگ جاتی؟"

"جناب لگ بھی جاتی ہے۔ کپڑے جل جاتے ہیں۔"

وہی قناعت اور سکون۔

"آج ہمارا دل بہت شاد ہے" ایک دن اس نے کہا "جنرل ضیاءالحق اپنے ملک کے لیے بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔"

غلام محمد پابندی سے بازار جا کر ریڈیو سنتا ہے۔ کشمیر کے بیشتر عوام کی طرح وہ بھی بے حد سیاسی آدمی ہے۔

غلام محمد جاہل ہے مگر اس کے لڑکے اسکول میں انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ اس کے بیوی بچے گاؤں میں رہتے ہیں۔

"تمہارے ہاں ہندو مسلم جھگڑا ہوتا ہے؟"

"نہیں جناب! گاؤں میں اگر پڑوس کی ایک پنڈت عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اور مسلمان عورت کے ہاں بھی تو وہ دودھ شریک بھائی بن جاتے ہیں" —— "کمال ہے۔"

"سامنے لدر کے اس پار نٹی شکارگاہ میں بارھویں صدی کا ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ ایک صبح مُلّا کی قسم کا لبادہ پہنے ایک شخص کیچڑ آلود سڑک

پر سر جھکائے ایک سُرخ رنگ کا کتا بچہ پڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ماتھے پر تلک۔ ایک مسلمان سیاہ داڑھی والا گوجر قلی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ "السلام علیکم، رادھا کرشن" اس نے پنڈت سے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

پنڈت جی مندر پہنچے۔ دروازہ کھولا اور اندر جا کر سُرخ پتھر کے قریب بیٹھ گئے۔ سامنے حوض میں سے چشمہ اُبل رہا تھا۔ نیچے سارا پہلگام پھیلا تھا۔ دریائے لِدر۔ بنگلے۔ بازار۔ خیمے سیاحوں کے غول۔ پنڈت جی سال کے بارہ مہینے اس مندر کے احاطے میں رہتے ہیں۔

صبح سویرے غلام محمد چوکیدار اور غلام رسول مالی اپنے کمرے میں چٹائی پر کانگڑیاں رکھے۔ کشمیری چائے پی رہے ہیں۔ حقہ سامنے رکھا ہے۔ رات کو اسی چٹائی پر کمبل بچھا کر سو جاتا ہے کانگڑی جلائے ایک غریب، جاہل صابر و شاکر کشمیری محوِ خواب اور وہ رسولؐ اللہ کی زیارت کرتا ہے۔

واہمہ؟ ہیلوسی نیشن؟ پیراسائیکولوجی؟

شور مچاتے گرجتے دریا لِدر کے اس پار پہاڑی پر مندر کے کمرے میں وہ پجاری بھی کانگڑی جلائے شنکرؑ کے تصور سے لو لگائے سو رہا ہوگا۔ اس کے بھی ہیں کچھ خواب۔

اور پہلگام سے اترتے ہوئے دامنِ کوہسار پر عیش مقام زین الدینؒ ولی کی پگوڈا نما درگاہ۔ بابا زین الدینؒ۔ نورالدینؒ عرف نندہ رشی کے سلسلے کے ایک مسلمان رشی تھے۔ غار میں رہتے تھے اسی جگہ جہاں

مزار ہے۔ نیچے شاہراہ پر مسلمان خانہ بدوش بکر والوں کے طویل قافلے گذر رہے ہیں۔ بالو کی متعدد چوٹیاں گوندھے گھوڑوں پر سوار عورتیں۔ بھیڑوں کے گلے۔ یہ بکروال ہر سال موسم گرما میں پونچھ سے اس طرف آتے ہیں۔ رات کو جنگل میں گھاس پر سوار رہتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کاؤنٹ بھی رکھتے ہیں۔ ہر ریوڑ کے پیچھے ایک ایک کتا رکھوالا چل رہا ہے۔ نہایت معتبر انداز میں، بے حد احساس ذمہ داری کے ساتھ گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھو میں ایک حقیر کتا ہوں۔ مگر کتنے بڑے سرمائے کی حفاظت میرے سپرد ہے۔"

اچھبل کا مغل باغ ترکی وضع کی کوشک فوارے، آبشار، نہریں، یہ باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کوکر ناگ کے راستے میں سکھوں اور مسلمانوں کے مخلوط گاؤں۔ کشمیری سکھ بھی نرم مزاج ہے۔ دیہات کے اسکولوں کے سامنے یونیفارم میں ملبوس بچے بچیاں۔ دو منزلہ مکانات۔ وہ غلاظت اور شدید افلاس کہیں نظر نہ آیا جو ہندوستان کے دیہات کی خصوصیت ہے۔

"بخشی صاحب بہت ترقی دے گئے۔ اب شیخ صاحب ترقی دے رہے ہیں۔ ابھی دلی سے نوے کروڑ روپیہ لائے ہیں" مارتنڈ کے مندر میں سرخ گلابوں کے پیچھے کھڑے ایک آدمی نے کہا۔

کوکر ناگ کے ڈاک بنگلے کے سبزے پر ایک آدمی سر جھکائے سفید کپڑے میں بندھا ایک صندوقچہ سامنے رکھے خاموش بیٹھا تھا۔ شاید کوئی شال فروش ہوگا۔ پارک میں دور دور تک متمول ہندوستانی سیاحوں کی

ٹولیاں مصروفِ تفریح تھیں۔ وہ ان کے پاس جاکر شالیں دکھانے کے بجائے اس طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سر اوپر اٹھایا وہ نابینا تھا۔

"آپ کیا بیچتے ہیں ۔۔۔ ؟"

"میں گوّیا ہوں جناب! کچھ سناؤں؟ اس نے خوش ہوکر پُرامید لہجے میں پوچھا۔ کسی نے اس سے بات ہی نہیں کی تھی۔

"کیا نام ہے ۔۔۔ ؟"

"غلام محمدؐ ۔۔۔ !"

کشمیر میں ہر دوسرے آدمی کا نام غلام محمد، غلام بنی، غلام رسول ہے۔ یہ ان کے بلے پناہ عشقِ رسول کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ مسلمان بچے کا نام غلام محمد کے علاوہ اور کیا ہونا چاہیئے۔!

"میں تین سال کی عمر سے اندھا ہوں، جناب! بڑا ہوکر اننت ناگ میں اُستاد وینا ناتھ مٹو سے پکا گانا سیکھا، بھائی کے ساتھ رہتا ہوں۔ روز صبح یہاں آکر بیٹھ جاتا ہوں۔ کوئی ٹورسٹ لوگ گانے کے لیئے کہیں تو سنا دیتا ہوں۔" اس نے مسکینی سے جواب دیا۔

"اس طرح کتنا کما لیتے ہیں ۔۔۔ ؟"

"کبھی دو تین روپلے، کبھی کچھ نہیں ۔۔۔ !"

ایک بار ریڈیو والے سرینگر سے آئے تھے انہوں نے کہا تھا بلالیں گے، ٹیپ لے گئے تھے ان کے خط کا روز انتظار کرتا ہوں۔ کچھ سناؤں؟ امیر خسرو

کی غزل سناؤں صاحب؟

"کشمیری گانا سنائیے؟"

وہ احتیاط سے ہارمونیم کا کپڑا ہٹا کر گاتا ہے، ؎

غنیمت شامِ غم دوزرا نہ روزرا
تمس زلفن پہ خم روزرا نہ روزرا

پھر وہ انتہائی عقیدت اور جوش کے ساتھ ایک نعت شروع کرتا ہے ؎

کسی نے قیس سے جا کر یہ پوچھا تو لیلیٰ پہ کیوں اتنا ہے مرتا
کہا لیلیٰ تو ہے بس اک بہانہ یہ عشق سارا محمدؐ ہی سے ہے

خزک درختوں میں چھپی فارسٹ لاج کا چوکیدار نظام الدین بھی پہلگام کے چوکیدار غلام محمد کی طرح بے حد سیاسی آدمی ہے۔ لیکن غلام محمد کے برعکس وہ پڑھا لکھا ہے اور نہایت فصیح و بلیغ اردو بولتا ہے۔ کہنے لگا۔ "جب اہل کشمیر نے جماعتِ اسلامی کے اراکین کے مکانات نذرِ آتش کیے۔ متعدد افراد یہاں بھی زیرِ حراست لئے گئے۔"

فارسٹ لاج کی پہاڑی کے نیچے سے پانچ چشمے ایک ساتھ نکلتے ہیں کوکر یعنی مرغی کے پنجے کی شکل میں یہ چشمے یکجا ہو کر ایک نظر فریب پارک میں سے گزرتے ہیں۔"

کوکر ناگ پارک میں سرینگر سے دن بھر کے لئے آئے ہوئے ہندوستانی سیاحوں کے جمِ غفیر کے علاوہ چناروں کے نیچے کالج اور اسکول کی لڑکیوں

کے گروہ ساتھ ان کی استانیاں اور بڑے بڑے ناشتہ دان سب یونیفارم کی شلوار قمیض میں ملبوس اور بے پردہ، اضلاع کی مسلمان لڑکیاں سرینگر جاکر انجینئرنگ، معاشیات قانون اور ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں تیس سال قبل وادی کے مسلمان مرد بھی عموماً جاہل تھے اپنے خط پنڈتوں سے پڑھواتے تھے۔

ویری ناگ ایک خواب ہے پور رومینٹک جہانگیر نے دیکھا نیلے پانی کے وسیع حوض کے گرد محرابوں والی عمارت سرد کمرے جن کے اندر جہانگیر اور نور جہاں دوپہر کو آرام کرتے ہوں گے حوض کی تہہ میں پوشیدہ چشمہ جہلم کا منبع ہے۔ جہلم حوض کی عمارت کے پھاٹک سے نکل کر تیز رو نہر کی صورت میں چناروں کے نیچے سے بہتا دور چلا جاتا ہے مغل انجینئرنگ کا کمال ہے کہ اس وسیع حوض کا پانی اس کے چوطرفہ بنی غلام گردش سے ایک انچ اوپر نہیں آتا۔ عمارت کے وسطی در میں مرمریں تختی پر کندہ ہے:۔

"پادشاہ ہفت کشور شہنشاہ عدالت گستر ابوالمظفر نورالدین جہانگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ غازی بتاریخ ۱۵ جلوس دریں سرچشمہ فیض آئین نزول اجلال فرمودند این عمارت بحکم آں حضرت
اتمام بنا سرکشید بر افلاک بانی تحمل یافت۔
تاریخش قصر آباد چشمہ ویر ناگ ۱۰۲۹ھ"

جہانگیر نے عمارت بنوائی شروع کی تھی شاہجہاں نے مکمل کروائی۔

دوسری تختی پر لکھا ہے :-

"حیدر بحکم شاہجہاں پادشاہ دہر شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار جوئے
ایں جوئی دادہ است زجوئے بہشت یاد - زیں آبشار یافتہ کشمیر آبروئے۔
تاریخ جوئے گفت باگوشم سرِ دش عیب - از چشمہ بہشت بیروں آمدست
بوئے "

گویا ۱۶۲۶ء - حیدر غالباً چیف انجینئر کا نام رہا ہوگا۔

فرغل پوش پنڈت گوپی ناتھ گائیڈ نے فر فر فارسی پڑھ کر سنائی۔
مغل دُنیا کے پانچ عظیم ترین ایمپائر بلڈرز میں سے تھے باقی چار
رومن اور عرب ان سے پہلے عثمانی ترک ان کے ہم عصر اور انگریز ان
کے بعد، دورِ مغلیہ میں کشمیر میں امن و امان تھا - اور صنعتی ترقی اور خوشحالی
ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا نظامِ حکومت یہاں بھی قائم کیا گیا تھا
ماہر ایڈمنسٹریٹر یہاں بھیجے جاتے تھے جن کو ان کی ٹرم کے خاتمے پر ٹرانسفر
کر دیا جاتا تھا۔ مغل نظامِ حکومت اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ انگریزوں نے سارے
ہندوستان میں اس میں رد و بدل نہیں کیا۔ اور ایڈمنسٹریشن کی وہی اصطلاحات آج تک مستعمل ہیں۔

اور مغل بادشاہ یہاں کس کروفر سے آتے ہوں گے اور کتنے مکمل
انتظام کے ساتھ۔ ہاتھیوں پر ہودے جن میں بیگمات بیٹھتی تھیں اور وہ
ہاتھی ان دشوار گزار پہاڑی راستوں پر چڑھتے تھے۔ کمال ہے اور گھوڑوں
پر سارا زبردست عملہ خزانہ - اعلیٰ عہدیدار اہلکار - ملازم - باورچی - ہزاروں
پر مشتمل شاہی قافلہ ہوتا ہوگا۔

شاہی کارواں کی بات تو چھوڑیئے۔ مغل گورنروں کی کیا شان و شوکت رہی ہو گی۔ جب وہ دورے پر نکلتے ہوں گے۔ قاسم خان بزبحر۔ نواب قلیچ خان۔ دلاور خان۔ ظفر خان۔ حسن علی مردان خان۔ آج کل اعلیٰ عہدیدار جب ان جگہوں پر پہنچتے ہیں تو ان کی اس قدر آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اس وقت بھلا کیا عالم رہا ہو گا۔ ذرا تصور کیجئے۔ نواب احمد بیگ خان۔ صوبیدار کشمیر کوکر ناگ میں زرنگار خیمے کے نیچے بیٹھے ہیں۔ سارے سرکاری حکام دست بستہ سامنے ایستادہ وہی پیٹرن آج تک موجود ہے۔

دریائے جہلم اس نیلے پرستانی حوض سے نکل کر اسی روانی سے بہے جا رہا ہے۔

سرینگر میں پبلک بسوں پر لکھا نظر آتا تھا "سرینگر سے اسلام آباد"

ہائیں یہ کیا انقلاب آیا راتوں رات۔ مصر۔ اسرائیل مصالحت کی طرح۔

یروشلم سے قاہرہ۔ سرینگر سے اسلام آباد۔!

معلوم ہوا، اننت ناگ کا دوسرا نام اسلام آباد ہے۔!

خیال رہے کہ پاکستان کے دارالخلافہ کا نام اسلام آباد ہے!

چشموں کے متعلق قدیم ہندو عقیدہ تھا جس کا ذکر کلہن پنڈت نے بھی کیا ہے کہ ہر چشمے کا محافظ ایک دیوتا ہے جو ناگ کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے لہٰذا کشمیری زبان میں چشموں کو ناگ کہتے ہیں۔ ویری ناگ۔ کوکر ناگ۔ اننت ناگ۔

گھنے چناروں کے اندھیرے میں سرد چشمے اور وشنو مندر۔ ایک مندر پر اردو

میں لکھا تھا۔ رام کنڈ ر ایک فربہ سادھو حوض میں نہا رہا تھا۔ دو سرے حوض پر دو نوجوان پنڈت اشنان میں مصروف تھے۔ پھاٹک پر مسلمان بوڑھے مصنوعات فروخت کر رہے تھے۔ نزدیک ایک گوردوارہ۔ اور مندر سے چند قدم کے فاصلے پر مسجد دارا شکوہ۔ خوبصورت عالیشان مسجد ہے!

اس فقیر شہزادے کے نام پر بنائی ہوئی مسجد پر گنبد کے بجائے چنار کا عظیم الشان چھتنار درخت سایہ فگن ہے۔

سرینگر میں زبرواں کی پہاڑی پر پری محل ہے جس میں دارا شکوہ تصوف کا مدرسہ اور ایک رصدگاہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ بے چارہ انوکھا درویش صفت شہزادہ "دیر فقیر دارا شکوہ قادری" جو آج موجود ہوتا تو نوبل پیس پرائز کا حقدار ہوتا۔

گندھک کا چشمہ اننت ناگ مندر کی خشک نیم تاریکی سے نکل کر مسجد دارا شکوہ کے روشن باغ کو سیراب کرتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ نہر کے کنارے ایک فرغل پوش بڑے میاں چہرہ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ نہر کی منڈیر پر اس اطمینان سے بیٹھے تھے گویا جنت میں تشریف فرما ہوں۔

"اس جگہ پر۔" انہوں نے سلیس اردو میں کہا "شہزادہ دارا شکوہ کا ایک کتبہ برآمد ہوا تھا۔ آزادی سے قبل اس مقام پر نماز پڑھنے کے لیے چبوترہ بنا دیا گیا اور یہ چنار کے درخت بھی جو سارے کشمیر میں موجود ہیں۔ مغلوں نے ایران سے یہاں لا کر لگائے تھے۔ خزاں میں ان کے پتے جب سرخ

ہو جاتے ہیں آگ سی دہکتی ہے۔ ایران قدیم میں کسی نے حیرت سے کہا ہو گا۔ چہ نار! کیسی آگ

"آپ کی طرف تو؟" انھوں نے بات کا رُخ بدلا۔

"بڑی گرمی پڑتی ہے۔ قحط بھی پڑتے ہیں پھل فروٹ تو سارا ہم لوگ یہاں سے آپ کو بھیجتے ہیں۔"

باغ رضوان کی سلسبیل کے کنارے بیٹھے بڑے میاں کو یہ احساس برتری بھلا کیوں نہ ہوتا۔!

باغ میں سُرخ گلابوں کی بہتات، حسین عورتیں کپڑے دھو کر سبزے پر سکھا رہی تھیں۔ باہر بازار میں اسکول اور کالج یونیفارم میں ملبوس بے پردہ لڑکیوں کی ٹولیاں۔

اننت ناگ سے سرینگر جانے والی سڑک کے دونوں طرف بید کے جھرمٹ بید کے ان درختوں میں کتنے اسٹیٹ پیسے مضمر ہیں سڑک کے کنارے کرکٹ کے بلّوں کے انبار یونہی رکھے ہیں کوئی چوری نہیں کرتا۔ کرکٹ کے بلّوں کے کارخانے۔ ایک حسین نابینا لڑکی، سبز رومال باندھے سبز پھرن میں ملبوس، ایک معمر عورت کا ہاتھ تھامے سڑک عبور کر رہی ہے۔

ایک چوبی مکان کے دروازے میں ایک باوقار عمر رسیدہ خوبصورت نورانی چہرے والی پنڈتانی لبادے میں ملبوس، پیشانی پر رو پہلی پٹی باندھے کھڑی ہے۔ یہ پٹی یا "ترنگ" قدیم یونانی اور رومن فیشن معلوم ہوتا ہے۔

جو اسی زمانے میں یہاں پہنچا ہوگا جب مارتند میں رومن طرز کا مندر تعمیر کیا گیا ہے۔

ایک نوجوان ساری پوش "دختر ک برہمنے" سے جس نے کانوں میں سہاگ کی نشانی بیحد طویل طلائی بندے پہن رکھے ہیں، باتیں کر رہی ہے اور قدیم یونانی دیوی سی معلوم ہوتی ہے۔

سرینگر۔ خانقاہ معلیٰ کے برآمدوں میں سفید صافے باندھے بوڑھے تسبیح پھیر رہے ہیں۔ جگہ جگہ "یا علی مدد" لکھا ہے۔ اور پھر پھاٹک پر ے

ہر فیض کہ در سابقہ ہر دو جہانست
در پیروئ حضرت شاہ ہمدانست

اندر خانقاہ معلیٰ کا جھاڑ فانوس سے سجا ہال ایک فنٹیسی ہے دیواروں پر حسین ترین گلکاری۔ ایک کونے میں وہ حجرہ جس میں شاہ ہمدانؒ نے قیام کیا تھا۔ اس کے نزدیک شیشے کی الماری میں علَم۔ "یہ حضرت علیؓ کا علَم ہے جو حضرت امیر کبیرؒ اپنے ہمراہ لائے تھے" مجاور نے کہا۔ ہال کے اندر بھی جگہ جگہ "یا علی مدد" لکھا تھا۔ شاہ ہمدانؒ کے اسی کشمیر میں صدیوں شیعہ سُنّی خون خرابہ ہوا۔ مذہبی سیاست میں منطق کا زیادہ دخل نہیں ہے۔ ایک جگہ لکھا تھا ے

یا علیؓ یک نظرے کُن ز سر صدق و صفا
کہ بجائے نرسد بے نظرِ پیر مُرید

خانقاہ معلیٰ ساری کی ساری لکڑی سے بنی ہے۔ بیرونی دیواروں پر

گل کاری کو صدیوں کی برفباری اور بارش نے زائل نہیں کیا۔ کیا باکمال کاریگر اور فنکار تھے۔ یہ خانقاہ جو ایک عالیشان چینی پگوڈا معلوم ہوتی ہے، کشمیر کی بیشتر عمارتوں اور مکانات کے مانند کئی بار جلی۔ سلطان محمد شاہ کی ملکہ صالحہ نے اپنے زیورات فروخت کر کے اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ کشمیر کی مساجد اور درگاہیں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان کا طرزِ تعمیر اسلامی کے بجائے بدھسٹ ہے۔

خانقاہ معلّیٰ جس قدر پُر رونق اور بشاش ہے، مزار السلاطین اتنا ہی اُجاڑ، سنسان اور غمزدہ تھا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سلطان زین العابدین کی والدہ کے مقبرے کے گنبد ارمنی طرز کے ہیں۔ دیواروں میں کہیں کہیں نیلے اصفہانی ٹائل باقی رہ گئے ہیں۔ باہر احاطے میں بہت سے سلاطین مدفون ہیں ایک مزار بڈشاہ کا ہے جو کھلے آسمان کے نیچے محوِ خواب ہے۔ ایک گھنے چنار کے نیچے سلطان حیدر شاہ کاشغری کی قبر ہے۔ ہمایوں کا خالہ زاد بھائی۔ جس نے کچھ عرصے کشمیر پر اپنے کزن کی طرف سے حکومت کی۔

مزار السلاطین کے احاطے میں ان گنت قبریں ہیں۔ کشمیری وضع کی۔ پتلی اور مختصر سی۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں۔

خواجہ خضر ہمراہ

اننت ناگ کے بازار میں ایک اندھا فقیر کشمیری میں کچھ گاتا ہوا بس کے اڈے پر مسافروں کے پاس جا جا کر دہراتا تھا۔ خواجہ خضر ہمراہ! خواجہ خضر ہمراہ!

سرینگر سے بانڈی پور کی سمت طویل خیابان پر دونوں طرف سفیدے اور بید کے جھنڈ اور چشمے۔ اور قالین کا ایک کارخانہ جس کا بورڈ جرمن زبان میں سڑک کے کنارے لگا ہے۔ ان کی تجارت مغربی جرمنی سے بہت زیادہ ہو گی۔ بڑے بڑے سماوار اٹھائے عورتیں دھان کے کھیتوں میں جا رہی ہیں۔ سماوار میں سے گرم بھاپ اٹھ رہی ہے۔ یہ منظر شمالی ایران ساحل کیپین کا بھی ہے ——!

ایک سڑک بارہ مولا جاتی ہے۔ تقسیم سے قبل لاہور کے سیاح اسی راستے

سے گرمیاں گزارنے کشمیر آتے تھے۔

ٹیکسی اب جھیل وُلر کے کنارے کنارے جارہی ہے۔ وُلر جس کے لیے اقبالؒ نے کہا تھا۔ ؎

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب
من خدارا دیدم اینجا بے حجاب

لیکن وُلر کا منظر بدل رہا ہے جھیل کا رقبہ کم ہوتا جارہا ہے۔ دلدل بڑھ گئی ہے۔ دھان اگانے کے لیے جھیل پاٹی جارہی ہے اب خواجہ خضر بھلا کیا سوچیں بگے وُلر کے کنارے۔ سو سال بعد کشمیر کا جغرافیہ ہی بدل چکا ہے۔ جنگل تیزی سے کٹ رہے ہیں ساری ریاست کی ٹمبر اکونومی ہے۔ اس بے حد سرد ملک کے عوام کو ایندھن چاہیئے۔ مکان لکڑی کے بنتے ہیں مصنوعات لکڑی کی ہیں۔ کاشت کاری اور چراگاہوں کے لیے مزید زمین درکار ہے۔

جنگل کٹنے سے آب و ہوا پر اثر پڑے گا۔ (ECOLOGY) کے ماہرین کو اس ہولناک مستقبل کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہے۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور جنگل تیزی سے کٹ رہے ہیں۔ سوڈیڑھ سو سال میں کشمیر کا حسن داستانِ پارینہ میں شامل ہوجائے گا۔ جب کہ حکومت سوئٹزرلینڈ اپنے ملک کے قدرتی حسن کا انتہائی احتیاط سے تحفظ کرتی ہے۔

بانڈی پور کے قریب چترنار میں محکمۂ جنگلات کے فارلیسٹ گارڈز کا تربیتی کالج ہے۔ فارسٹ گارڈز کو بہت قلیل تنخواہیں ملتی ہیں۔ چترنار وادی کشمیر کے خوبصورت ترین علاقوں میں سے ہے۔ سیاحوں کی یلغار سے محفوظ،

پرسکون اور پُر امن فارسٹ لاج کے کنارے پائین کے گھنے جنگل میں کوئی مستقل بول رہی ہے ؎

چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوت شاخسارے (اقبال)

بہت دور سفید گلاب اور لیونڈر کی جھاڑیوں کے اس پار جھیل ڈل کر نظر آرہی ہے اور سلسلۂ کوہ۔ سبز اور نیلگوں۔ باغ کے نیچے چشمہ بہہ رہا ہے بادِ بہار موج موج۔ مرغِ بہار فوج فوج۔ صلصل و سار زوج زوج۔

فارسٹ لاج کا رجسٹر جو ۴۲ء میں تھا وہی آج تک مستعمل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتنے کم لوگ یہاں آتے ہیں۔

۴۲ء سے ۴۵ء تک سردار محمد عبداللہ خاں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل سرینگر۔ ڈاکٹر مس ایلن کرم، ویمنز میڈیکل سروس الور سے آئی تھیں۔ ۴۴ء میں میجر جنرل ایچ ٹی ڈی ہکمین۔ آر ایس میل انسپکٹر جنرل پولیس سرینگر۔ لفٹیننٹ بارکر، رائل نیوی۔ ڈی جی کیرنن اسسٹنٹ ماسٹر ایچیسن چیفس کالج لاہور۔

جنرل ہکمیں اگر جنگ عظیم میں کام نہیں آئے تب بھی شاید اب تک انگلستان کے کسی قصبے میں داعئ اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں نوجوان لفٹیننٹ بارکر اگر مارا نہیں گیا تو بوڑھا ہو چکا ہوگا۔ مس کرم شاید مر چکی ہوگی۔ ڈکٹر کیرنن بفضلِ خدا انگلستان میں بقیدِ حیات ہیں۔

فارسٹ لاج سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک نوے سالہ بزرگ

رہتے ہیں۔ حاجی کوثر علیشان۔ افغانستان سے تشریف لائے تھے۔ واپس نہیں گئے۔ سوائے عیدین کے سال کے بارہ مہینے روزے رکھتے ہیں۔ بیحد سویٹ بزرگ ہیں۔ اور سچے فقیر۔ اور انتہائی روشن خیال۔ مکان کے سامنے ایک چشمہ جاری ہے۔ وہیں پر انہوں نے ایک اسکول قائم کیا ہے جس میں آٹھویں جماعت تک انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ اسکول کی سہ منزلہ چوبی عمارت زیر تعمیر ہے لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔ سفید شلوار، اودی قمیض اور اودے اسکارف کا یونیفام پہنے بچیاں کلاس کے بعد حاجی صاحب کے اسکول سے نکل رہی ہیں۔ انہیں سیاست سے بھی دلچسپی ہے انہوں نے آج کل کے اہم سیاسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "حرفِ حق" ہے!

گلمرگ میں ڈرائنگ روم کے دریچے میں سے ناگھا پربت کی چوٹی اور ہرمکھ کا سلسلۂ کوہ نظر آرہا ہے اور پڑوس کا وہ سبز رنگ کا بنگلہ جہاں سے ۱۹۵۲ء میں ایک روز شیخ عبداللہ اچانک گرفتار کر لیے گئے تھے۔

کھن مرگ کی چڑھائی پر ایک مضمحل خچر تنہا چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ "اس کا مالک اور سواری اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ کمزور ہے، اوپر نہیں جاسکتا۔" گھوڑے والے محمد سلطان نے کہا۔

"اتنا کمزور کیوں ہے۔؟"

"اس کے مالک کی آمدنی زیادہ نہیں ہوگی۔ پوری طرح کھلا نہیں

سکتا ہوگا۔ خود میرے گھر میں چھ انسان روز کھانے والے ہیں اور ایک گھوڑا"
محمد سلطان ہانپ رہا تھا۔ وہ بارہ مولا کا گوجر تھا۔

"تم بیمار ہو؟"

جی ہاں۔ دل کی تکلیف ہے۔ اس لیے کھلن مرگ سواریاں نہیں لے جاتا۔
ڈاکٹر کو دکھایا۔ وہ مہنگے نسخے لکھ دیتے ہیں، کہاں سے خریدوں"

نیچے ایک آسٹریلین فرم انٹرنیشنل گولف کورس بنا رہی ہے۔ سامنے برف پر پھسلنے والوں کے لیے بڑھیا ہوٹل ہیں۔ گلمرگ کو عالمی سطح کی تفریح گاہ بنایا جا رہا ہے۔

"اگر شیخ صاحب یہاں فیکٹری شیکٹری لگا دیں تو لوگوں کو صرف ٹورسٹوں کے پیچھے نہ دوڑنا پڑے" گلمرگ سے اترتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔
کشمیری عوام کا سیاسی شعور تعجب خیز ہے۔!

تنگ مرگ میں ڈیزی کے پھولوں کی فراوانی تھی

سری نگر اور ساری وادیٔ کشمیر کے شہروں اور قصبوں کی دکانوں میں جگہ جگہ مقدس عمارات کی تصاویر اسی طرح نمایاں جگہوں پر آویزاں ہیں۔ گوٹے کے ہاروں سے مزین۔

جماعت اسلامی کے اراکین کے جو مکانات جلائے گئے بلوائیوں کے اس غم و غصے میں طبقاتی نفرت بھی غالباً کار فرما تھی۔ سوپور نئے کاروباریوں کا مستقر ہے۔ وہ لوگ اس قدر امیر ہو چکے ہیں کہ سوپور "نیو انگلینڈ" کہلاتا ہے اور یہ تاجر زیادہ تر جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا سوپور بھی

بلوائیوں کے حملے سے نہ بچ سکا۔

حضرت بل کے علاقے میں عیدین کی سی چہل پہل تھی۔ میلہ بھر رہا تھا۔ "کل بڑا دن تھا معراج مبارک۔ تین دن سے موئے مبارک کی زیارت کروائی جا رہی ہے" تنگ مرگ سے واپسی پر سرینگر حضرت بل کی سڑک پر پہنچتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

حضرت بل کو عہدِ شاہجہانی میں باغ صادق خاں کہتے تھے (نواب صادق خاں امرائے شاہجہاں کے زمرے میں شامل تھے) آج سے تقریباً پونے تین سو سال قبل ایک بزرگ خواجہ نورالدین موئے مبارک سرینگر لائے۔ اسے جہانگیر کی بنوائی ہوئی مسجد میں محفوظ کیا گیا۔ شاعر نے تاریخ کہی ؎

کشمیر مدینہ شد از موئے نبیؐ

عاشقانِ رسول کی یہ قوم موئے مبارک سے جو شدید عقیدت رکھتی ہے اس کا مظاہرہ بخشی غلام محمد مرحوم کے دورِ حکومت میں اس تبرک کی پُر اسرار گمشدگی کے دنوں میں ہوا۔ سرینگر برفپوش تھا۔ ساری وادیٔ کشمیر سے عوام اُمنڈ کر سرینگر آگئے۔ اسی برفباری میں رات بھر وہ سڑکوں پر بیٹھ کر زار زار روتے اور کہتے۔ "ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے۔ بس ہمیں موئے مبارک واپس کرو۔" موئے مبارک کی بازیافت کے بعد ان کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

۲۳ جون ۹۷ء کے روز صبح سے حضرت بل کے باغات، ڈل کے گھاٹ اور سڑکوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ معراج مبارک کا سالانہ میلہ۔ مرد عورتیں، بچے جو ساری وادی سے بسوں میں بھر بھر کر وہاں آئے تھے۔

بے پردہ عورتیں ۔ کتنے چناروں کے نیچے بیٹھے پکنک منا رہے تھے۔ میلے کی دکانوں پر ٹھٹھ لگے تھے ۔ ظہر کی نماز کے بعد موئے مبارک کی زیارت ہونے والی تھی۔ مرمریں مسجد کے بڑے ہال میں مرد انتہائی خوش الحانی سے متواتر درود شریف پڑھ رہے تھے ۔ باہر وسیع چبوترے پر عورتیں بیٹھی تھیں ۔ وہ بھی مردوں کے ساتھ ساتھ آواز ملا کر درود خوانی میں مصروف تھیں ۔ ہر عمر کی عورتیں ۔ نوجوان لڑکیاں سب بے پردہ ۔ کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا کشمیری تہذیب کا یہ سب سے زیادہ تابناک پہلو ہے ۔

نمازیوں کی بھیڑ بڑھتی گئی ۔ بہت سے مرد بھی آ کر اسی چبوترے پر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے ۔ ایک معمر سبز پوش عورت نہایت خود اعتمادی سے ڈانٹ ڈانٹ کر صفیں درست کرتی پھر رہی تھیں ——— !

سُنو ! اسلام دو ہیں ۔ ایک میدانوں کے مُلّا کا اسلام اور ایک وادئ کشمیر کا ۔ یہ لوگ اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے بیرونی دنیا سے علیٰحدہ رہے ہیں اس وجہ سے ان کے ہاں اسلام اپنی پاکیزگی کے ساتھ محفوظ ہے ۔ یوں تو ہندوستان میں بھی غریب مسلمان عورتیں پردہ نہیں کرتیں ۔ شہروں اور کھیتوں میں کام کرتی ہیں ۔ ملّا ان کے خلاف بے پردگی کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے ۔ پردہ محض نچلے متوسط ، متوسط اور اونچے طبقے کا اسٹیٹس سمبل ہے ۔

مسجد حضرت بل میں نماز کے بعد ایک مینار میں سبز چوغے میں ملبوس ایک مولوی صاحب نمودار ہوئے ۔ ان کے ہاتھ میں بلّور اور چاندی کا ایک سلنڈر سا تھا جسے انہوں نے نیچے مجمع کی طرف بڑھایا ۔ اتنی دُور سے موئے مبارک نظر

نہیں آسکتا تھا۔ مگر ہجوم پر ہیبت اور سکتہ طاری تھی۔ بہت سی عورتیں اور مرد رو رہے تھے۔ عورتیں ہاتھ پھیلا کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ مجمع پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری تھی۔ عشق نبیؐ کا یہ ایک حیرت انگیز نظارہ تھا۔ ؏

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

چند منٹ بعد مولوی صاحب دوسرے مینار میں آئے اور اس سلنڈر کی زیارت کرائی۔ باہر باغ میں اور سڑکوں پر پولیس کے افسروں۔ اور سپاہیوں نے بلحاظ ادب جوتے اتار دیئے تھے اور ننگے پاؤں ڈیوٹی پر مستعد تھے۔ بہت سے لوگ رو رہے تھے زیارت کے بعد پھر باجماعت درود شریف شروع ہو گیا اور کشمیری میں نعتیں۔ نہایت سُریلی CHANTING۔ یہ حضرت بل کے علاوہ وادیٔ کشمیر کی مسجد میں ہر نماز کے بعد دیر تک جاری رہتی ہے۔ اور مسلسل باجماعت درود شریف صلی اللہ علیک یا رسول اللہ۔ وصلعم علیک یا حبیب اللہ — اور مسلسل CHANT —

زِدنی بِردتی یا رزاق

ارحم حالے یا رحمٰن

اُستر عیبِ یا ستّار

حضرت بل کے نزدیک کشمیر یونیورسٹی کیمپس پر سینکڑوں مسلمان بے پردہ لڑکیاں اطمینان کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہیں۔ گو شہر میں نئے دولتمند طبقے کے چند افراد نے نہ ہی "MOD" طرزِ زندگی بھی جو برصغیر میں اسی قسم کے لوگوں کے ہاں آچکا ہے۔ نمعلوم کشمیری تہذیب کی یہ پاکیزگی اور

سادگی اور اخلاص اور مہمان نوازی کب تک قائم رہ سکے گی۔ آج کے صنعتی دور میں اکثر اقوام کو اپنی مادی ترقی کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور کشمیری شیلومت اور اسلامی تصوف کے زیر اثر ہندو مسلم اتحاد۔ کم از کم ایک حد تک ضرور موجود ہے۔

حضرت بل میں مغرب کی اذان ہوئی۔ نزدیک کی ایک کوٹھی کے لان پر موجود نوجوان کشمیری ہندو ڈاکٹر نے کھڑے ہو کر حضرت بل کی طرف نمسکار کیا۔

سری نگر سے جموں جاتے ہوئے اودھم پور میں ایک اور مسلمان بزرگ کی پگوڈا نما درگاہ جس کے احاطے میں ہولی ہوکس کھلے ہوئے تھے۔ جموں کے باشندے کالج کے تعلیم یافتہ نوجوان ہندو ڈرائیور نے ٹیکسی روکی درگاہ کا مجاور لپکا ہوا آیا۔ ڈرائیور نے اسے دو روپے دیئے اور ٹیکسی آگے بڑھائی۔

خیاباں کے دونوں طرف رواں چشموں کی وجہ سے سڑک کی سرمئی سطح پر سراب برابر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

عباسی عقیدتوں کی یگانگت بھی برصغیر میں صدیوں سے موجود رہی ہے اور سراب کی طرح غائب بھی ہو جاتی ہے۔ صبح کے اخبار میں ندیا کے فساد کی خبریں چھپی تھیں۔ بنگال میں بھی سارے برصغیر کی طرح بہت سے اولیاء کے مزار موجود ہیں جن پر ہندو اور مسلمان اسی طرح اظہار عقیدت کرتے ہیں۔

وادی میں ہر جگہ فرسٹ ایڈ اسٹیشن اور اسکول اور کالج نظر آتے ہیں۔

کشمیر واقعی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور شہر اور قصبے صاف ستھرے ہیں۔

جموں کے راستے میں جگہ جگہ خونی نالہ اور شیطانی نالہ کہلانے والی جگہیں ملتی ہیں۔ نئے پہاڑی راستوں کی تعمیر سے قبل بہت حادثے ہوتے تھے۔ حادثے اب بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک گھاٹی میں ایک ٹرک الٹا پڑا تھا۔ ڈرائیور نے کہا چند روز ہوئے سات آدمی مر گئے۔ ڈرائیور عبدالغفور کی شادی ہونے والی تھی۔ میرا دوست تھا۔

ہمارے ہاں بسوں اور ٹرکوں پر اُردو میں جو دلچسپ اشعار اور تک بندیاں درج ہوتی ہیں ان کی ایک بیاض مرتب کرنی چاہیئے اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اُردو شاعری اپنے عوامی روپ میں کسقدر مقبول ہے۔ بانہال شہر میں ایک ٹرک پر لکھا تھا ؎

مہندی رنگ لاتی ہے سوکھ جانیکے بعد   محبت یاد آتی ہے بچھڑ جانیکے بعد

یہ شعر یقیناً ڈرائیور صاحب یا ٹرک کے مالک نے خود کہا ہوگا۔ رنگ لاتی ہے حنا ...... اسسے متاثر ہو کر۔

دوسری ٹرک پر لکھا تھا ؎

وفا کر ان حسینوں کو جو حُسن پر ناز کرتی ہیں
لگا کر تیل زلفوں میں ہمیں برباد کرتی ہیں

وفا یعنی دفع۔

بانہال سرنگ کے پھاٹک پر ایک مدراسی سپاہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سرنگ کی دوسری طرف سے دوسری دنیا شروع ہو جاتی ہے۔ طلسماتی

وادیٔ کشمیر پیچھے رہ گئی۔

جموں کی سرسبز پہاڑیاں۔دریائے چناب کا رنگ اب تاریخی نہیں رہا۔ یہ دریا بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے پاکستان جا رہا ہے۔اس کے گدلے پانی میں لکڑی کے گٹھے بہہ رہے ہیں۔ان پر نمبر پڑے ہیں COLLECTING STATIONS پر ان کے مالک نمبر دیکھ ان کو نکال لیتے ہیں۔بہت سے گٹھے پاکستان بھی نکل جاتے ہیں، اور انسان کی زندگی بھی ان گٹھوں کی طرح ہے جو دریا میں بہے جا رہے ہیں۔ COLLECTING STATION پر موت کا فرشتہ نمبر دیکھ کر گٹھا نکال لیتا ہے۔!

چناب جموں کے بھدرا ضلع کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔راستے کے ساتھ بہتے بہتے وہ اچانک ایک تنگ نالے میں تبدیل ہو کر بھدرا کی سمت مڑ جاتا ہے یا یوں کہئے کہ وہاں سے ایک تنگ نالے کی صورت میں نکلا تھا۔

بادل گھر آئے۔نینی ٹوپ پر بارش ہونے لگی۔راستے کے کنارے لوگ سیب اور آڑو بیچ رہے تھے۔یہاں سے سنٹرل ایشیا کے بجائے پنجاب کی کلچر بیلٹ شروع ہو جاتی ہے اور پر نینی ٹوپ پارک میں کسی کی شادی کا بینڈ بج رہا تھا۔بہت دور نیچے کھڈ میں وہ ٹرک الٹی پڑی تھی جس کے نوجوان ڈرائیور عبد الغفور کی چند روز بعد شادی ہونے والی تھی مگر وہ کھڈ اس کا STATION CLLECTING تھا اس کا نمبر آگیا اور ملک الموت اسے نکال لے گئے۔

ساری وادی، سارے جموں میں ترقی اور بڑھتی ہوئی خوشحالی کے آثار

نظر آتے ہیں۔ ہر جگہ چپّے چپّے پر کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ سرکاری اور نجی عمارتیں بن رہی ہیں یا نئی سڑکیں اور پل اور کارخانے۔ بھکاری بہت ہی کم دکھلائی دیئے۔ اور وہ ویرانی افلاس اور پسماندگی کہیں نظر نہ آئی جو کمایوں اور گڑھوال کے پہاڑوں کی خصوصیت ہے۔

جموں شہر پہنچ کر ڈرائیور نے ایک انگریزی وضع کے قلعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ مہاراجہ ہری سنگھ کا محل تھا۔"